ماہنامہ

# حکمت قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۰۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۴

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ
خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

# حکمتِ قرآن

لاہور


جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

—— یکے از مطبوعات ——

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

زر سالانہ /۲۰ روپے

اس شمارے کی قیمت /۲

# فہرس

جلد اول | ستمبر ۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء | شمارہ: ۷ ۔ ۸


- حکم و عبر ———— ۳
  انصار احمد
- قرآن حکیم اور موجودہ نظام تعلیم ———— ۷
  ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ
- مسئلہ وحدۃ الوجود ———— ۲۳
  پروفیسر یوسف سلیم چشتی
- المضاربۃ والمزارعۃ ———— ۳۱
  مولانا سید حامد میاں
- حسی معجزات — ایک توجیہہ ———— ۳۷
  ڈاکٹر عبد الخالق
- علم اور رجائیت ———— ۴۲
  صلاح الدین ایوبی
- انسان: صلاح و فسادِ عالم کا مرکزی کردار ———— ۴۷
  مولانا الطاف الرحمٰن بنوی
- برصغیر میں علمِ حدیث تابعین کے عہد میں ———— ۵۹
  مولانا محمد اسحٰق بھٹی
- دوسرے سالانہ محاضراتِ قرآنی (اجمالی رپورٹ) ———— ۷۱
  ڈاکٹر عبد السمیع


ناشر: **ڈاکٹر اسرار احمد**

طابع: ایس ۔ اے ۔ سلیم ۔ مطبع: آفتاب عالم پریس ۔ لاہور

ایسار احمد

# حکمت و عبر

ہم قارئین کی خدمت میں حکمت قرآن کا تیسرا باقاعدہ شمارہ پیش کر رہے ہیں۔ پہلے دو پرچوں کے بارے میں ہمیں متعدد تعریفی خطوط وصول ہوئے ہیں اور اس کے اجراء کو سراہا گیا ہے۔ ان سے ہماری ہمت افزائی ہوئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہل قلم حضرات جو بالخصوص دینی موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں، اپنی نگارشات سے ہمیں نوازیں گے۔ اور یہ اس پرچے کی افادیت میں اضافے کا باعث ہوں گی۔

دینی اعتبار سے علم و حکمت کی اہمیت مسلم اور اظہر من الشمس ہے۔ نص قرآنی ہے۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (سورۃ فاطر: آیت: ۲۸) خشیت الٰہی سفر زندگانی میں ہمیں صراط مستقیم پر کاربند رکھنے کا بنیادی عامل ہے، اور قرآن نے اس کو اہل علم و دانش سے مختص کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ علم و معرفت ہی وہ جوہر ہے جس سے قلب انسانی میں صحیح طور خدا کی کبریائی اور اپنی بے مائیگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان کا عمل سواء السبیل سے مطابقت پیدا کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے عام مشاہدہ یہ ہے کہ فی زمانہ علماء (الا ماشاء اللہ) خشیت الٰہی کے جذبات سے عاری اور تہی دامن ہیں۔ اور ان کا عملی رویہ اور اخلاق کسی اعتبار سے عامۃ الناس سے اعلیٰ و افضل نہیں۔ چنانچہ ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ قرآن کس قسم کے علماء اور کس قسم کا علم رکھنے والے اصحاب علم کے بارے میں یہ صراحت کرتا ہے کہ ان کے دل خشیت الٰہی سے معمور ہوتے ہیں۔

یہاں دنیا اور اس کی خواہش و طلب کے اعتبار سے امام غزالیؒ کی علماء کے درمیان تین اقسام کی تخصیص کا ذکر نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ امام موصوف علماء کی مندرجہ ذیل تین اقسام بیان کرتے ہیں۔

(۱) وہ جو اپنے آپ کو بھی ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور دوسروں کو بھی ہلاک کرتے ہیں - یہ وہ لوگ ہیں جو صراحتہً دُنیا اور دنیاوی منفعت کے حصول میں لگے ہوئے ہیں - اور اسی کی طرف دعوت دیتے ہیں - ان کی مثال اس آگ کی سی ہے جو خود بھی جلتی ہے اور دوسروں کو بھی جلاتی ہے -

(۲) وہ علماء جن کا ظاہر سلف کی طرح مخلصانہ ہے لیکن بباطن ان کا اصل ہدف بھی دنیا اور اس کی طلب و خواہش - یہ خود تو دُنیا طلبی کی وجہ سے ہلاکت ں پڑیں گے ہی لیکن دوسروں کو اس سے بچالیں گے - اس کی مثال شمع ں سی ہے جو خود جلتی اور پگھلتی ہے، لیکن دوسروں کو اپنی روشنی سے بہرہ مند کرتی ہے -

(۳) آخری قسم ان علماء پر مشتمل ہے جو خود بھی سعادت سے بہرہ مند ہیں اور دوسروں میں بھی سعادت و برکت پھیلانے کا باعث بنتے ہیں - جن کے ظاہر و باطن میں ثوابِ آخرت اور حصولِ رضائے الٰہی کا جذبہ کارفرما ہے -

یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ علماء کی آخر الذکر قسم ہی ان اصحاب علم پر مبنی ہے جن کے دل میں محبت خداوندی کے ساتھ ساتھ خشیتِ الٰہی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں - اور حصول علم کے سلسلے میں ان کا مقصد بجز معرفت و تقرب الٰہی کے اور کچھ نہیں ہوتا -

جہاں تک قسمِ علم کا تعلق ہے - تو اس کا اوّلین اطلاق بلاریب قرآن و سنّت اور ان سے مستفاد علوم پر ہوتا ہے - دوسرے علوم و فنون کی حیثیت بہرحال ثانوی درجے میں ہوگی - ایک روایت میں مذکور ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا، آج علم کا ۹/۱۰ حصہ فوت ہو گیا - اس پر ان سے کہا گیا کہ آپ یہ کہتے ہیں حالانکہ ہم میں صحابہ کی بہت بڑی تعداد بحمداللہ موجود ہے انہوں نے کہا علم سے میری مراد جدل و احکام اور فتویٰ و رائے نہیں - بلکہ وہ علم ہے جس کا تعلق اللہ تعالےٰ کی ذات گرامی سے ہے - یہ ہے وہ علم جو سیکھنا چاہیئے اور یہ ہے وہ علم جس کا ۹/۱۰ حصہ حضرت عمر کی وفات کے بعد دُنیا سے اُٹھ گیا - حضرت عمرؓ کے بارے میں ہمیں مستند تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے

کہ انہوں نے صبیغ کو جب اس نے دو آیتوں میں تعارض دکھایا تو دُرّوں کی سزا دی، اس کا مقاطعہ کیا۔ اور لوگوں کو بھی تلقین کی کہ اس کا سوشل بائیکاٹ کریں۔ اس طرح گویا انہوں نے بے کار بحث و تمحیص سے عامۃ الناس کو ہمیشہ کے لئے بچانا چاہا۔

ثانوی درجے میں 'علم' ان تمام مباحث اور مضامین کو محیط ہے جو آجکل علوم جدیدہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں طبیعات بھی شامل ہے، اور ریاضی بھی، کیمسٹری اور دوسرے تمام طبعی علوم بھی۔ علاوہ ازیں طبعی علوم کے علاوہ سوشل سائنسز اور بالخصوص نفسیات بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ علم نفسیات موجودہ دور میں خصوصی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اور جدید تجربی منہاج نہ صرف انسان کی داخلی ذہنی کیفیات کو سمجھنے کے لئے استعمال کی گئیں، بلکہ ان کا استعمال لاشعور اور مذہبی و روحانی واردات کے مطالعے میں بھی کیا گیا۔ متعدد واقعات اس طرح کے ہمارے سامنے آتے ہیں کہ بڑے بڑے سائنسدان اور ماہرین فلکیات وغیرہ اپنی ذہنی کاوشوں کے آغاز میں تشکیک اور مذہب لاادریت کا شکار تھے۔ لیکن جوں جوں انہوں نے اپنے اپنے میدانوں میں تبحّر علمی حاصل کیا۔ وہ ایک قادر مطلق ہستی اور خالق کائنات کے معترف ہوتے چلے گئے۔

'حکمت قرآن' کے اجراء میں ہمارا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عام مروّجہ روش سے ہٹ کر اس پرچے میں ایسے علمی مضامین کو شائع کیا جائے کہ جو ایک طرف گہری بصیرت اور ذہنی کاوش کے اعلیٰ نمونے ہوں، اور جدید علمی و تحقیق محاسن سے آراستہ ہوں۔ تو دوسری طرف ان کا بنیادی مقصد یہ ہو کہ وہ عمل پر ابھاریں، اور ذہنی و قلبی کیفیات ان کے زیر اثر مترتب ہوں۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو صرف زبان تک محدود ہے۔ یہ تو خلق اللہ پر بمنزل دلیل و حجت ہوا۔ دوسرا دل سے لگاؤ رکھتا ہے۔ یہی علم نافع ہے۔"

---

زیر نظر شمارہ اکثر و بیشتر اُن مقالات پر مشتمل ہے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقدہ محاضرات قرآنی (Quranic Seminars) کے موقع

پر پڑھے گئے ۔ قرآن کانفرنس کی جگہ سالانہ محاضراتِ قرآنی کے سلسلے کا اجرا دو سال قبل کیا گیا تھا۔ یہ محاضرات ہر سال مارچ کے مہینے میں قرآن اکیڈمی (۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور) میں منعقد ہوتے ہیں ۔۔۔ بہت ہی سنجیدہ اور باوقار اور علمی ماحول میں مختلف موضوعات پر اصحابِ علم و فضل ایک مقالے کی صورت میں اپنا اظہارِ خیال فرماتے ہیں، اور ہر مقالے کے اختتام پر سوال و جواب کی صورت میں اُس پر بحث و تمحیص کیا جاتا ہے ۔۔۔ دوسرے سالانہ محاضراتِ قرآنی کی اجمالی رپورٹ بھی اس شمارے میں قارئین کی نظر سے گزرے گی ۔(ان شاءاللہ)

آخر میں ہم قارئینِ حکمتِ قرآن سے معذرت خواہ ہیں کہ اس مرتبہ بھی ہم دو ماہ کا مشترکہ شمارہ اُن کی پیش خدمت کر رہے ہیں ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی پرچے کے آغازِ اجرا میں کچھ موانع اور مشکلات پیش آتی ہیں ۔ اُمید ہے کہ جلدی ان پر قابو پا لیا جائے گا ۔ ہماری کوشش یہی ہوگی کہ آئندہ اس سلسلے میں شکایت کا موقعہ نہ دیا جائے ۔

OOOOOOO

# قرآنِ حکیم اور موجودہ نظامِ تعلیم

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

ڈاکٹر گورایہ نے بہ حد درجہ مبسوط مقالہ دوسرے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے چوتھے اجلاس میں پیش فرمایا تھا

اسلام کا نظامِ تعلیم و تربیت دنیا میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ انتہائی مبارک و مسعود ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین اور تلقین و تخطیط ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی۔ اس سے ملّتِ ابراہیمی اور اُمّتِ محمدیہ کے درمیان دینی اور روحانی گہرے روابط استوار ہوئے۔

نظامِ تعلیم چار بنیادی عناصر پر مشتمل ہوتا ہے:-

(۱) مرکزِ تعلیم (۲) طلبہ (۳) معلّم (۴) نصابِ تعلیم و تربیت

سیدنا ابراہیمؑ کی لازوال عظمت و بصیرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے نظامِ تعلیم و تربیت کے ان چاروں بنیادی عناصر کا تصوّر فرمایا اور انہیں معرضِ وجود میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا فرمائی۔

(۱) تعمیرِ بیت اللہ (مرکزِ تعلیم)

(۲) تخلیقِ اُمّتِ مسلمہ (طلبہ)

(۳) بعثتِ محمدی (معلّم)

(۴) تلاوت و تزکیہ اور تعلیم و حکمت (نصابِ تعلیم و تربیت)

## ۱۔ تعمیرِ بیت اللہ (مرکزِ تعلیم و تربیت)

مرکزِ تعلیم و تربیت کی تاسیس و قیام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔

| | |
|---|---|
| واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبل | اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دعا کی) |

منا انك انت السميع العليم[1]

جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا (اور جاننے والا) ہے۔

(۲) تخلیقِ امّتِ مسلمہ (طلبہ)

درس گاہ بیت اللہ میں عبادت اور حصولِ تعلیم و تربیت کے لئے آپ نے امّتِ مسلمہ کی تخلیق کے لئے دعا فرمائی:

ربنا واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك[2]

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیئے اور ہماری اولاد میں سے ایک امّتِ مسلمہ پیدا فرمائیے!

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور امّتِ مسلمہ پیدا فرمائی۔

وكذلك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس[3]

اور اس طرح ہم نے تم کو امّتِ معتدل بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

(۳) بعثتِ محمدی (معلّم)

درس گاہ بیت اللہ میں امتِ مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دینے کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے ایک رسول کی بعثت کے لئے دعا فرمائی:

ربنا وابعث فيهم رسولا منهم[4]

اے ہمارے پروردگار اس امت میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما!

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور امّتِ مسلمہ میں اپنے فیض و کرم اور فضل و احسان سے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو رسول بنا کر بھیجا:

---

۱۔ القرآن الحکیم (۲ : ۱۲۷)
۲۔ القرآن الحکیم (۲ : ۱۲۸)
۳۔ القرآن الحکیم (۲ : ۱۴۳)
۴۔ القرآن الحکیم (۲ : ۱۲۹)

| | |
|---|---|
| لقد من اللہ علی المومنین اذ | خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان |
| بعث فیھم رسولاً من انفسھم[۵] | میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔ |

(۴) **نصاب تعلیم و تربیت** — اُمت مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے ایک نصاب تعلیم و تربیت تجویز فرمایا اور بارگاہ رب العزت میں منظوری کے لئے پیش فرمایا:

| | |
|---|---|
| یتلوا علیھم آیتک ویعلمھم | وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے، |
| الکتب والحکمۃ ویزکیھم[۶] | اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور |
| | ان کا تزکیہ کرے۔ |

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے مجوزہ نصاب تعلیم و تربیت کو شرف قبولیت بخشا اور اس کے مطابق امت کی تعلیم و تربیت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمایا۔

| | |
|---|---|
| ھو الذی بعث فی الامیین | وہی تو ہے جس نے امیوں میں انہی |
| رسولاً منھم یتلوا علیھم | میں سے رسول بھیجا۔ جو ان پر اسکی |
| آیتہ ویزکیھم ویعلمھم | آیتوں کی تلاوت کرتا ہے۔ ان کا |
| الکتب والحکمۃ[۷] | تزکیہ کرتا ہے۔ اور کتاب اور حکمت |
| | کی تعلیم دیتا ہے۔ |

ان مباحث سے معلوم ہوا کہ تعمیر بیت اللہ، تخلیق امت مسلمہ، بعثت محمدیؐ اور تجویز و ترتیب نصاب تعلیم و تربیت ایک ہی مقدس و مذہب سلسلے کی مضبوط و مرصوص کڑیاں ہیں۔ اس کا آغاز سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ابو الانبیاء سے ہوا اور تکمیل سید المرسلین رحمۃ للعالمین اور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔

عہد نبوی کا نظام تعلیم و تربیت انہیں عناصر اربعہ پر استوار تھا۔ جن کی تجویز و ترتیب اور تاسیس و تشکیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ اب ان چاروں عناصر کی مختصر طور پر

---

۵۔ القرآن الحکیم (۳ : ۱۶۴)

۶۔ القرآن الحکیم (۲ : ۱۲۹)

۷۔ القرآن الحکیم (۲ : ۶۲)

اہمیت بیان کی جاں ہے۔

**مرکز تعلیم** انسانیت کی اولین عبادت گاہ اور مرکز تعلیم و تربیت بیت اللہ شریف ہے۔ اسے دنیا کے تمام مراکز اور درس گاہوں پر جن خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے، قرآن نے ان کا ذکر اسطرح فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| ان اول بیت وضع للناس للذی | پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہی |
| ببکۃ مبارکاً وھدی للعالمین[۸] | ہے جو مکے میں ہے مبارک اور دنیا کیلئے موجب ہدایت۔ |

اس آیت میں بیت اللہ کی دو صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ (۱) مبارک (۲) ھدی للعالمین ایک جگہ بیت اللہ کی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس میں داخل ہونے والے کو امن و سکون نصیب ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| ومن دخلہ کان اٰمناً[۹] | جو اس میں داخل ہوا اس نے امن پالیا |

ایک جگہ بیت اللہ کو انسانیت کی اجتماع گاہ اور امن گاہ قرار دیا گیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامناً[۱۰] | اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔ |

قرآن و سنت اور سیرت و تاریخ میں بیت اللہ کی اور بھی کئی صفات بیان ہوئی ہیں مذکورہ آیات میں بیت اللہ کی صفات یہ ہیں:۔ مبارک 'ھدی للعالمین' اجتماع گاہ انسانیت اور امن گاہ انسانیت' ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی تعمیر فرمائی۔ یہ مسلمانوں کا دوسرا بڑا تعلیمی و روحانی مرکز قائم ہوا۔ اور یہ بھی انسانیت کے لئے برکت' ہدایت' اجتماع اور امن کا موجب ثابت ہوا۔ اسی طرح جیسے جیسے انسانیت دائرہ اسلام میں داخل ہوتی چلی گئی اور اسلام اکناف و اطراف عالم میں پھیلتا چلا گیا ویسے ویسے ان اولین

---

۸ ۔ القرآن الحکیم ( ۳ : ۹۶ )

۹ ۔ القرآن الحکیم ( ۳ : ۹۷ )

۱۰ ۔ القرآن الحکیم ( ۲ : ۱۲۵ )

اسلامی تعلیمی و روحانی مراکز کی طرز پر تعلیم و عبادت گاہیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ مسلمانوں کی درسگاہیں بابرکت ہوتی تھیں۔ کیونکہ ان کے بانی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں خلوص، نیک نیتی اور تقوی کی بنیاد پر ان کی تعمیر کرتے تھے۔ ان میں رشد و ہدایت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں برکت و ہدایت کی موجودگی انسانیت کو اپنی طرف کھینچتی تھی اور متلاشیان حق اور تشنگان علم جوق در جوق ان اجتماع گاہوں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ان کا پرامن اور پرسکون ماحول علم و تحقیق کے لئے مہمیز اور تعقل و تفکر کے لئے تحرک و تھیج کا باعث بنتا تھا۔

درحقیقت اسلامی درسگاہوں میں برکت اور ہدایت کا ماحول طلبہ کی خداداد صلاحیتوں کو ابھرنے پر آمادہ کرتا، اور امن و اجتماع کی معتدل، خوشگوار اور سازگار فضا انہیں بڑھنے پھلنے، پھولنے اور پروان چڑھنے کے وسیع و وافر مواقع فراہم کرتی تھی۔ مسجد نبوی بطور درسگاہ نظم و نسق کے اعتبار سے مثالی، امن و سکون کے اعتبار سے نمونہ، برکت و ہدایت کے اعتبار سے بے مثل، صحابہ کرامؓ علوم و فنون کی ہر نوع کا علم حاصل کرتے۔ مختلف مسائل حیات پر اجتہاد و تحقیق کی تربیت پاتے، تلاش و جستجو کی تڑپ کے تحت بہت سے علمی، فکری اور تحقیقی سوال کرتے۔ اس آزادانہ علمی ماحول میں ان کی علمی و فکری تربیت ہوئی۔ درس گاہ میں نظم و ضبط کا سب سے بڑا اور اہم ترین قاعدہ اور قانون معلم اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اور سیرت و کردار تھا۔ جبر و اکراہ اور تحکم و تسلط کی جگہ معلم کی اخلاقی قوت اور اس کی ذات کی عظمت و رفعت تھی۔ یہ فضا صحابہؓ کی صفات عالیہ کو پروان چڑھاتی اور شر و فساد کو دخل اندازی کا موقع نہ دیتی۔

ان اسلامی درسگاہوں اور ان کے اوصاف و صفات کا موازنہ جب عہد حاضر کی درس گاہوں سے کیا جاتا ہے تو ان کے مقصد و مدعا، ان کے ماحول اور ان کی فضا کا آپس میں کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا۔ عہد نبوی کے تعلیمی و روحانی مراکز کی صفت قرآن نے یہ بیان کی ہے۔

لمسجد اسس علی التقوی للہ — مسجد جس کی بنیاد تقوی پر رکھی گئی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری درسگاہوں کی بنیاد بھی تقوی ہی ہے۔ کیا ان کا مقصد و مدعا اور ان کا ماحول اور فضا وہی ہے جو عہد نبوی کی تعلیم گاہوں کی تھی؟ آج دو قسم کی درسگاہیں قائم ہیں۔ ایک جدید نظام تعلیم کی درس گاہیں اور دوسری قدیم نظام تعلیم کی درسگاہیں۔ جدید نظام

---

۱۱ - القرآن الحکیم (۹ : ۱۰۸)

تعلیم کی درسگاہوں کا اصل الاصول تو مغربی فکر و فلسفہ ہے اگرچہ فروعات میں "لازمی دینیات" کے نام سے بھی ایک مضمون مختلف تعلیمی سطحوں پر شامل نصاب ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ اپنی مبادیات اور قواعد و کلیات کے اعتبار سے اسلامی معاشرت، نفسیات، تہذیب و تمدن اور دین و عقیدہ سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ حال ہی میں اشراکیت و اشتمالیت نے بھی ہماری درسگاہوں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ اس صورتحال سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان درسگاہوں کے سامنے ملک و ملت کے حوالے سے کوئی بنیادی مقصد و مدعا موجود نہیں۔ اس نظام کے داعی اس کے حق میں اگر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں تو فقط یہ کہ اس سے خواندگی کی شرح بڑھتی ہے اور نوکری مل جاتی ہے اور بس! اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہماری درسگاہوں کا مقصد و مدعا ہی متعین نہیں تو ان میں برکت و ہدایت اور اجتماع و امن کا ماحول کیسے پیدا ہو۔ اور اگر ان میں انتشار و افتراق فساد و طغیان اور قتل و بغاوت ہے تو یہ اسی صورت حال کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگر وہ مبارک کی جگہ نامبارک، ہدایت کی جگہ ضلالت، اجتماع کی جگہ انتشار اور امن کی جگہ فساد کا نقشہ پیش کرتی ہیں تو یہ نتیجہ ہے اس نفاق کا جو تقویٰ کی جگہ ان درسگاہوں کی بنیاد ہے اور بغاوت ہے نوجوان نسل کی اس طبقہ کے خلاف جو اس نظام پر حاوی ہے جو یا تو نفاق کی وجہ سے مثبت تبدیلی کے حق میں نہیں یا نااہلیت کے سبب بہتر نظام کے قیام کے قابل نہیں۔

دوسری درسگاہیں قدیم نظام تعلیم کی درسگاہیں ہیں۔ جن میں عربی اور مذہبی نصاب تعلیم رائج ہے۔ ان میں خلوص و تقویٰ موجود ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی فرقہ واریت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ مختلف فرقوں کی درس گاہوں کے احاطوں میں امن و سکون رہتا ہے۔ مگر ان کے فارغ التحصیل جب مستند ہو کر باہر نکلتے ہیں تو ان میں کشیدگی پائی جاتی ہے۔ جس کا اندازہ مساجد و محافل کے مختلف اجتماعات اور عبادت گاہوں پر قبضہ کرنے سے ہوتا ہے۔

ہماری جدید و قدیم درس گاہوں کو بامقصد و تعمیری خطوط پر قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان کی بنیاد قرآن حکیم کی رہنمائی میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی و روحانی درسگاہوں کی طرح تقویٰ پر رکھی جائے۔ انہیں برکت و ہدایت کا سرچشمہ اور امن و اجتماع کا مرکز بنایا جائے۔

**طلبہ** طلبہ نظام تعلیم کا انتہائی اہم عنصر ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طلبہ صحابہ کرام تھے، ان کی صفات قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ میں موجود ہیں۔ جن

کے سرسری مطالعہ سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد اپنی سیرت کی تشکیل، کردار کی پختگی، دنیوی امور میں مہارت اور اخروی مقاصد کا حصول تھا۔ خشیت الٰہی کے تحت حقوق و فرائض کی تعیین اور ادائیگی میں توازن اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ایثار، قربانی، محبت، شفقت، ہمدردی، غمگساری، محنت، دیانت، قابلیت سے کام لینا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے لئے انتہا درجے کا شوق و ذوق، محنت و مشقت، احقاقِ حق اور ابطال باطل ان کے اوصاف تھے۔

قرآن حکیم نے عقل و فکر، تدبر و تعقل پر بڑا زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی کی درسگاہوں میں اندھی تقلید اور جمود کی جگہ اجتہاد کا دور دورہ تھا۔ صحابہ کرام اپنی ذہنی، فکری، قلبی اور روحانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے تھے۔ ان میں افراط و تفریط کی جگہ اعتدال تھا۔ دینی اور دنیوی امور میں توازن تھا۔ علوم و فنون میں انہماک انہیں اپنے خالق و مالک کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتا تھا۔ اور زہد و تقویٰ دنیوی امور میں مہارت کے مانع نہیں ہوتا تھا۔ ان کے سامنے نظامِ تعلیم کا مقصد و مدعا واضح تھا۔ اس لئے وہ اس کے حصول کے لئے ہمہ تن مصروف و مشغول رہتے۔ اپنی تمام توانائیاں اس کو حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیتے اور پورے امن و سکون کے ساتھ حصولِ علم میں لگے رہتے۔ پوری دلجمعی کے ساتھ اعلیٰ مقاصد کا حصول ان کا مطمحِ نظر ہوتا بلند و بالا امور کی طلب و جستجو کی لگن کے سبب غیر ضروری، فضول اور بیکار کاموں کیلئے ان کے پاس وقت ہی نہ تھا۔

یہی وہ صفاتِ عالیہ اور اوصافِ حمیدہ تھیں جن کی بدولت قلیل ترین مدت میں صحابہ کرام نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے فقہ و قانون میں وہ اجتہادات کئے جن کی روشنی انسانیت کو آئین و قوانین کی ترتیب میں ہمیشہ راہ دکھاتی رہے گی۔ تعمیر و تشکیلِ شخصیت میں انہوں نے ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک انسانوں کے لئے رہبر و رہنما کی حیثیت سے موجود رہیں گی۔ علم و فضل اور عقل و تدبر کے ایسے شاہکار سامنے لائے جو تاریکی و جہالت سے نکلنے والوں کے لئے مشعل کا کام دیتے رہیں گے۔ طلباءِ درس گاہِ عہد نبوی اور طلباءِ عہدِ حاضر کے موازنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں انتہائی بُعد ہے، اُن میں شوق و ذوق ان میں لاپرواہی و بے رغبتی، ان میں اجتہاد و جستجو ان میں جمود و بے اعتنائی، اُن میں مقصد و مدعا کے حصول کی تڑپ ان میں مقصد و مدعا کی بے یقینی، وہ تعمیر کے لئے بے قرار یہ

تعلیم کی درسگاہوں کا اصل الاصول تو مغربی فکر و فلسفہ ہے اگرچہ فروعات میں "لازمی دینیات" کے نام سے بھی ایک مضمون مختلف تعلیمی سطحوں پر شامل نصاب ہے۔ مغربی فکر و فلسفہ اپنی مبادیات اور قواعد و کلیات کے اعتبار سے اسلامی معاشرت، نفسیات، تہذیب و تمدن اور دین و عقیدہ سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ حال ہی میں اشتراکیت و اشتمالیت نے بھی ہماری درسگاہوں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔ اس صورتحال سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان درسگاہوں کے سامنے ملک و ملت کے حوالے سے کوئی بنیادی مقصد و مدعا موجود نہیں۔ اس نظام کے داعی اس کے حق میں اگر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں تو فقط یہ کہ اس سے خواندگی کی شرح بڑھتی ہے اور نوکری مل جاتی ہے اور بس! اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہماری درسگاہوں کا مقصد و مدعا ہی متعین نہیں تو ان میں برکت و ہدایت اور اجتماع و امن کا ماحول کیسے پیدا ہو۔ اور اگر ان میں انتشار و افتراق فساد و طغیان اور قتل و بغاوت ہے تو یہ اسی صورت حال کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگر وہ مبارک کی جگہ نامبارک، ہدایت کی جگہ ضلالت، اجتماع کی جگہ انتشار اور امن کی جگہ فساد کا نقشہ پیش کرتی ہیں تو یہ نتیجہ ہے اس نفاق کا جو تقویٰ کی جگہ ان درسگاہوں کی بنیاد ہے اور بغاوت ہے نوجوان نسل کی اس طبقہ کے خلاف جو اس نظام پر حاوی ہے جو یا تو نفاق کی وجہ سے مثبت تبدیلی کے حق میں نہیں یا نااہلیت کے سبب بہتر نظام کے قیام کے قابل نہیں۔

دوسری درسگاہیں قدیم نظام تعلیم کی درسگاہیں ہیں۔ جن میں عربی اور مذہبی نصاب تعلیم رائج ہے۔ ان میں خلوص و تقویٰ موجود ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی فرقہ واریت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ مختلف فرقوں کی درس گاہوں کے احاطوں میں امن و سکون رہتا ہے۔ مگر ان کے فارغ التحصیل جب مستند ہو کر باہر نکلتے ہیں تو ان میں کشیدگی پائی جاتی ہے جس کا اندازہ مساجد و محافل کے مختلف اجتماعات اور عبادت گاہوں پر قبضہ کرنے سے ہوتا ہے۔

ہماری جدید و قدیم درس گاہوں کو با مقصد و تعمیری خطوط پر قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان کی بنیاد قرآن حکیم کی رہنمائی میں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی و روحانی درسگاہوں کی طرح تقویٰ پر رکھی جائے۔ انہیں برکت و ہدایت کا سرچشمہ اور امن و اجتماع کا مرکز بنایا جائے۔

**طلبہ** طلبہ نظام تعلیم کا انتہائی اہم عنصر ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طلبہ صحابہ کرام تھے، ان کی صفات قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ میں موجود ہیں۔ جن

کے سرسری مطالعہ سے یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ ان کا سب سے بڑا مقصد اپنی سیرت کی تشکیل، کردار کی پختگی، دنیوی امور میں مہارت اور اخروی مقاصد کا حصول تھا۔ خشیت الٰہی کے تحت حقوق و فرائض کی تعیین اور ادائیگی میں توازن اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ایثار، قربانی، محبت، شفقت، ہمدردی، غمگساری، محنت، دیانت، قابلیت سے کام لینا تھا۔ مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے لئے انتہا درجے کا شوق و ذوق، محنت و مشقت، احقاقِ حق اور ابطال باطل ان کے اوصاف تھے۔

قرآن حکیم نے عقل و فکر، تدبر و تعقل پر بڑا زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی کی درسگاہوں میں اندھی تقلید اور جمود کی جگہ اجتہاد کا دور دورہ تھا۔ صحابہ کرام اپنی ذہنی، فکری، قلبی اور روحانی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے تھے۔ ان میں افراط و تفریط کی جگہ اعتدال تھا۔ دینی اور دنیوی امور میں توازن تھا۔ علوم و فنون میں انہماک انہیں اپنے خالق و مالک کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتا تھا۔ اور زہد و تقویٰ دنیوی امور میں مہارت کے مانع نہیں ہوتا تھا۔ ان کے سامنے نظامِ تعلیم کا مقصد و مدعا واضح تھا۔ اس لئے وہ اس کے حصول کے لئے ہمہ تن مصروف و مشغول رہتے۔ اپنی تمام توانائیاں اس کو حاصل کرنے کے لئے وقف کر دیتے اور پورے امن و سکون کے ساتھ حصولِ علم میں لگے رہتے۔ پوری دلجمعی کے ساتھ اعلیٰ مقاصد کا حصول ان کا مطمحِ نظر ہوتا بلند و بالا امور کی طلب و جستجو کی لگن کے سبب غیر ضروری، فضول اور بیکار کاموں کیلئے ان کے پاس وقت ہی نہ تھا۔

یہی وہ صفاتِ عالیہ اور اوصافِ حمیدہ تھیں جن کی بدولت قلیل ترین مدت میں صحابہ کرام نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے فقہ و قانون میں وہ اجتہادات کئے جن کی روشنی انسانیت کو آئین و قوانین کی ترتیب میں ہمیشہ راہ دکھاتی رہے گی۔ تعمیر و تشکیلِ شخصیت میں انہوں نے ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک انسانوں کے لئے رہبر و رہنما کی حیثیت سے موجود رہیں گی۔ علم و فضل اور عقل و تدبر کے ایسے شاہکار سامنے لائے جو تاریکی و جہالت سے نکلنے والوں کے لئے مشعل کا کام دیتے رہیں گے۔ طلباءِ درس گاہِ عہد نبوی اور طلباءِ عہدِ حاضر کے موازنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں انتہائی بُعد ہے، اُن میں شوق و ذوق ان میں لاپرواہی و بے رغبتی، ان میں اجتہاد و جستجو ان میں جمود و بے اعتنائی، اُن میں مقصد و مدعا کے حصول کی تڑپ ان میں مقصد و مدعا کی بے یقینی، وہ تعمیر کے لئے بے قرار یہ

تخریب کے لئے بے چین وہ سراپا ادب و احترام یہ نمونہ توہین و تحقیر

یہ لازم نہیں کہ اب ایسے مخلص، محنتی اور با مقصد طلبہ بالکل مفقود ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ایسے طلبہ موجود ہیں۔ اور ان پر قوم کو فخر ہے۔ البتہ قابلِ غور امر یہ ہے کہ اسوقت کس ذہنیت کا غلبہ ہے؟ اور تخریب و انتشار کا رُخ تعمیر و سکون کی طرف کس طرح موڑا جا سکتا ہے۔ میری سمجھ میں صرف ایک ہی بات آتی ہے کہ طلبہ میں صفاتِ صحابہ کرام پیدا کی جائیں۔ ان کے سامنے درسگاہِ نبوی کے تلامذہ کا نقشہ پیش کیا جائے، ان میں جوشِ عقیدہ پیدا کیا جائے اور اس عقیدہ کے مضمرات ان کے عمل اور سیرت و کردار کا رُوپ دھارتے چلے جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ صحابہ کرام کے علمی کارنامے اور حصولِ علم میں ان کی جد و جہد اور مصائب و آلام کی برداشت پر مبنی نصاب تیار ہو۔

**معلّم** نظامِ تعلیم و تربیت میں معلّم کو مرکزی و محوری حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم کے اوّلین معلّم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

انما بعثت معلما [۱۲] — مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اس منصب پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلے آپؐ نے اپنی قبل از نبوت سیرت و کردار کے بارے میں اپنے اہلِ شہر سے دریافت فرمایا کہ میں آپ لوگوں میں زندگی بسر کر چکا ہوں۔ آپ نے مجھے کیسا پایا؟ سب لوگوں نے شہادت دی کہ ہم نے آپؐ کو ہمیشہ صادق و امین پایا۔ ہم نے آج تک آپؐ سے سوائے سچ کے کچھ نہیں سُنا۔ اہلِ شہر کی اسی شہادت کو قرآن حکیم نے اس آیتِ کریمہ میں بیان کیا ہے۔

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ — میں قبل ازیں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں
افلا تعقلون [۱۳] — کیا تم سمجھتے نہیں

آپؐ کے خُلقِ عظیم کی شہادت سب سے آخری آسمانی وحی قرآن حکیم نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے۔

وانک لعلیٰ خلق عظیم [۱۴] — آپ یقیناً خلقِ عظیم رکھتے ہیں

---

۱۲۔ ابن ماجہ، سنن، مقدمہ، ۱۷

۱۳۔ القرآن الحکیم (۶۸ : ۴) ۱۴۔ القرآن الحکیم (۱۰ : ۱۶)

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصب نبوت کے متعلق ارشاد فرمایا:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق[۱۵] — میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلمی کے فرض کو جس حسن و خوبی سے انجام دیا وہ ایک ابدی و سرمدی نمونہ عمل ہے۔ اس فریضے کی انجام دہی کے لئے آپؐ نے جس خلوص، جذبے، محنت، محبت اور ہمدردی کو اپنایا اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی بصیرت افروز انداز میں اس آیت میں بیان فرمایا۔

فلعلك باخع نفسك على آثارهم ان لم يؤمنوا بهذا الحديث اسفا[۱۶] — (اے پیغمبرؐ) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپؐ ان کے پیچھے رنج کرکے اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔

جب تک معلم کو اپنے مقصد و مشن کے ساتھ ایسی ہی وابستگی نہ ہو اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں تعلیم و تبلیغ کے منصب پر فائز ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، اعمال اور سیرت و کردار کا جو نمونہ بحیثیت مجموعی نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسے قرآن حکیم نے تمام انسانیت کے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے اور قیامت تک تعلیم و تبلیغ سے وابستہ انسانوں کو اسے اپنانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی تعلیم ہے۔

لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة[۱۷] — تحقیق تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

تاریخ اسلام اس بات پر شاہد ہے کہ معلمین اسلام نے فرائض تعلیم سنبھالنے سے پہلے اپنی سیرت و کردار کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالا۔ پورے جذبے، شوق اور مشن کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کی۔ بکمال خلوص، محنت اور جانفشانی اپنے تلامذہ میں علم و ہنر کی جستجو اور تحقیق و اجتہاد کی تڑپ پیدا کی۔

---

۱۵۔ امام مالک الموطا، باب حسن الخلق، ۸

۱۶۔ القرآن الحکیم (۱۸ : ۶)

۱۷۔ القرآن الحکیم (۳۳ : ۲۱)

عہدِ حاضر میں اخلاق و کردار کی پستی اور سیرت و اعمال کی گراوٹ کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بحیثیت مجموعی اس کی تہہ میں معلّمین کا کردار پوشیدہ ہے۔ ان کی مقصد و مدّعا سے لاپرواہی، محنت و جانفشانی سے پہلوتہی، طلبہ سے بے رغبتی وہ عوامل ہیں جن کا پرتَوان کے زیرِ تعلیم طلبہ کی ذات و شخصیت پر پڑتا ہے۔ جب تک معلّمین اپنی سیرت و کردار اور اعمال و افعال کو اسوۂ حسنہ کے مطابق نہیں ڈھالتے اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور عمدہ کردار کو طلبہ کے لئے نمونے کے طور پر پیش نہیں کرتے اسوقت تک قومی و ملّی اخلاقی گراوٹ کا رُخ تعمیر و ترقی کی طرف نہیں موڑا جا سکتا۔

نظامِ تعلیم سے وابستہ معلّمین کے لئے لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسوہ "وانك لعلیٰ خلق عظیم" اور آپ کے کردار "فلعلك باخع نفسك علیٰ اثارهم ان لم یومنوا بهذا الحدیث اسفا" کو اپنائیں اور اس کے مطابق تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیں۔

**نصابِ تعلیم و تربیت** قرآن حکیم کی سورۂ بقرہ، آل عمران اور جمعہ میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقاصد اور آپکی نبوّت و رسالت کے فرائض منصبی بیان ہوئے ہیں۔ انہیں مقاصدِ نبوّت کے مطابق آپ ﷺ نے امّتِ مسلمہ کی تعلیم و تربیت فرمائی اور انہیں بنیادی تعلیمی اصولوں پر عہدِ نبوّی کا نصابِ تعلیم و تربیت مشتمل تھا۔

١۔ تلاوتِ آیات (یتلوا علیهم آیاتك)
٢۔ تعلیمِ کتاب (ویعلمهم الکتب)
٣۔ تعلیمِ حکمت (والحکمة)
٤۔ تزکیۂ نفس (ویزکیهم)

**تلاوتِ آیات** سب سے پہلے تلاوتِ آیات کو لیجئے۔ امام راغب اصفہانی تلاوت کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| والتلاوة تختص باتباع کتب الله المنزله | تلاوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتب کی اتباع کے لئے مخصوص ہے۔ |

اِس کے ساتھ ہی تلاوت کا یہ معنی بھی ہے۔

| | |
|---|---|
| یقال فی القرآن فی شئی اذا قرأتہ | قرآن حکیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب |
| وجب علیك اتباعه | تو نے اسمیں سے کچھ پڑھا تو تیرے اوپر اس کی اتباع واجب ہوگئی۔ |

تلاوت سے مراد قرآن حکیم کے اوامر و نواہی اور احکام و تعلیمات کی تلاوت، ان پر عمل کے نقطۂ نظر سے کرنا ہے۔ تلاوت کے دو مفہوم ہیں:-

۱۔ قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور ان کا تقدس

۲۔ قرآنی احکام و قوانین اور اخلاقی و روحانی تعلیمات کی اتباع

اس سے ظاہر ہے کہ "یتلوا علیھم آیتك" کا مفہوم یہ ہوا کہ قرآنی آیات کو عام کیا جائے انہیں نہایت دِلسوزی کے ساتھ تلاوت کر کے ذہن نشین کیا جائے، قلب و روح پر ان آیات کو نقش کیا جائے۔ ملک و معاشرے میں موجود ہر فکر و فلسفہ پر ان آیات کا غلبہ ہو۔ شعر و ادب پر قرآنی آیات کی چھاپ ہو۔ معاشرے میں تمام افکار و خیالات ان کے تابع ہوں۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں ان کا چرچا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے وصال تک مسلسل اس طرح تلاوت فرمائی کہ قرآنی آیات روزمرہ کا موضوع بن گئیں۔ موافق و مخالف سب انہیں کے متعلق گفتگو کرتے۔ آپؐ نے تلاوت کے ذریعے قرآن کو اتنا عام کر دیا کہ قبل از اسلام کا شعر و ادب دَب کر رہ گئے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر قرآنی آیات کا چرچا ہونے لگا۔ حتیٰ کہ قبل از اسلام عرب تہذیب و ثقافت کا سرمایا "سبع معلقات" بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور ان کی جگہ قرآنی آیات نے لے لی۔

آج اگر عہدِ نبویؐ کے نصابِ تعلیم کے پہلے جزو "تلاوت آیات" پر مبنی ملک کے نظام تعلیم کو ترتیب دیا جائے تو نہایت صدق اور اخلاص کے ساتھ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں "تلاوت آیات" کو نصابِ تعلیم میں پوری پوری اہمیت دینا ہوگی۔ ایک مقررہ مدت کے اندر اندر ملک کے ہر فرد میں تلاوت آیات کی استعداد پیدا کرنا ہوگی۔ اس کا عملی طریق کار یہ ہو سکتا ہے۔

۱۔ ہمارے نظامِ تعلیم کے درجہ ابتدائیہ (پرائمری) میں پورے قرآن ناظرہ کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ تاکہ ملک کے ہر پرائمری پاس بچے میں پورے قرآن حکیم کو ناظرہ طور پر پڑھنے

کی استعداد پیدا ہو جائے۔

۲۔ اس سلسلے میں دوسرا قدم یہ اٹھایا جائے کہ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ مختلف موضوعات کے تحت آسان اور عام فہم اردو زبان میں طلبہ کو پڑھایا جائے۔

**تعلیم کتاب** عہدِ نبوی کے نصاب تعلیم کا دوسرا بڑا اصول تعلیم کتاب ہے۔ کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی سب سے آخری وحی کتاب اللہ، قرآن حکیم ہے۔ اس کی تعلیم سے مراد اس کے احکام، تعلیمات، ارشادات، ہدایات، اوامر و نواہی کی تعلیم ہے پوری کتاب کو سمجھنا اس کے معانی و مفاہیم کو جاننا، اس میں دیئے گئے احکام کا علم حاصل کرنا، اس کی تعلیمات، ارشادات اور ہدایات کا فہم و ادراک پیدا کرنا اس کے اوامر اور نواہی کو سیکھنا تعلیم کتاب ہے۔ قرآن حکیم خالق کی طرف سے مخلوق کے لئے آخری، مکمل، تمام کمال، غیر متغیر، غیر متبدل، ابدی سرمدی ہدایت ہے۔ ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اسے پڑھے، اسے سیکھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے۔ تعلیم کتاب میں فرد سے زیادہ معاشرے پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسکا اہتمام کرے۔ عام حالات میں ہر فرد کو خود بخود تعلیم کتاب کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لئے یہ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم معرضِ وجود میں لائے جس کی بنیاد "تعلیم کتاب" پر ہو۔ قرآنی آیات کو پڑھنا اور ان کی تلاوت کرنا، تلاوت آیات ہے۔ تعلیم کتاب سے مراد ان آیات میں دی گئی تعلیمات کو سیکھنا، انہیں جاننا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ تلاوت کے علاوہ قرآنی آیات کا معنی اور مفہوم سمجھا جائے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملک و ملت کے ہر فرد کو اس کا اہل بنانا کہ وہ قرآن حکیم کی جملہ تعلیمات کو سمجھ سکے۔ اسلامی معاشرے کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنے اس فریضہ کو اپنی حکومت کی وساطت سے انجام دیتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حکومت پر اس فریضہ کی اصل انجام دہی عائد ہوتی ہے۔ حکومت تمام مسلمانوں کے لئے "تعلیم کتاب" کا اہتمام اپنے نظام تعلیم کے ذریعے کر سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک و مسعود عہد میں جو نصاب تعلیم ترتیب دیا تھا اسمیں تعلیم کتاب ہی کو بنیادی، محوری اور مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کی حکومت کے جملہ ذرائع و وسائل تعلیم کتاب کے لئے وقف تھے۔ سربراہ حکومت اور تمام اعیان و اعوان مملکت تعلیم کتاب میں مصروف تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے خصوصی تربیت گاہیں برائے اساتذہ قائم فرمائیں۔ تربیت یافتہ اساتذہ کو ملک کے طول و عرض میں تعلیم کتاب

لے لئے مامور فرمایا۔ مسجد سب سے بڑی درسگاہ قرار پائی۔ ملک کی تمام مساجد تعلیم کتاب کے لئے وقف تھیں، اور تمام مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ مسجد میں حاضر ہوں اور کتاب کا علم حاصل کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کا نظام تعلیم ایک مثالی نظام تھا۔ اس نظام کے ذریعے ہر مسلمان میں اتنی استعداد پیدا کر دی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اُس کی کتاب، قرآن حکیم کو پڑھ کر خود سمجھ سکتا تھا۔ کتاب اللہ کی اس وسیع پیمانے پر تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی حکومت کے تمام شعبے خود بخود اسلامی سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔ معیشت، معاشرت، سیاست، عدالت، حکومت، تہذیب، تمدّن، ثقافت، نہایت آسانی، دلی رغبت اور سہولت کے ساتھ اسلامی رنگ اختیار کرتے چلے گئے۔ تعلیم کتاب مسلمانوں کے اخلاق و کردار پر اثر انداز ہوئی اور مسلمان کتاب اللہ کی تعلیمات کے زیر اثر انسانیت کے لئے نمونہ بن گئے۔ ان کے اعمال، افعال، سیرت، کردار، تہذیب اور اخلاق انسانیت کے لئے معیار قرار پائے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو سیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ نظام حکومت کو چلانے والے عمّال اور حکام دیانت، امانت، محنت اور خدمت کا شاہکار بن کر سامنے آئے۔ عوام صدق، خلوص، ایثار، ہمدردی، اخوت، محبّت، اتحاد و اتفاق کا مجسّمہ بن کر دوسری انسانیت کے سچے محسن و غم خوار ثابت ہوئے شر، فساد، فحش، منکر مغلوب ہو گئے اور خیر و معروف، صلاح، فلاح غالب ہو گئے۔ بزدلی چوری، دغا، فریب، مکّاری، عیّاری کی جگہ شجاعت، اولوالعزمی، بلند ہمتی، عزم صمیم، صدق اور خلوص، اسلامی معاشرت کا طرۂ امتیاز قرار پائے۔ یہ وہ نتائج ہیں جو صرف ایک درست قدم اٹھانے سے برآمد ہوئے اور یہ درست قدم تعلیم کتاب کو نظام تعلیم کا مرکز قرار دینا تھا۔

"تعلیم کتاب" کو موجودہ نظام تعلیم میں رائج کرنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ درجہ ثانویہ (میٹرک) تک اسے لازمی قرار دیا جائے۔ ان پانچ سالوں میں "تعلیم کتاب" کو اس طرح نصاب کا حصّہ بنایا جائے کہ میٹرک پاس کرنے تک ہر طالب علم لازمی طور پر پورے قرآن مجید کا ترجمہ سیکھ جائے اور قرآن کی بنیادی تعلیمات کو پوری طرح سمجھ جائے۔ جسطرح حصّہ پرائمری میں پورا قرآن ناظرہ پڑھا دیا جائے۔ اسی طرح حصّہ میٹرک میں پورے قرآن کا ترجمہ سکھا دیا جائے۔

**تعلیم حکمت** قرآنی نصاب تعلیم و تربیت کا تیسرا بڑا اصول تعلیم حکمت (والحکمۃ) ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا حکمت سے مراد دین کی معرفت اس کی فقہ

اور اس کی اتباع ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک حکمت سے مراد سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ امام رازی نے فرمایا کہ کتاب سے مراد قرآنی احکام ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و شرائع کی حکمت اور ان میں انسانیت کے لئے مصالح و منافع کا بیان ہے۔ ان آئمہ مجتہدین و مفسّرین کی آراء سے ظاہر ہوا کہ قرآنی نصاب تعلیم کا اصول "والحکمۃ" ایک نہایت جامع اصطلاح ہے جس میں وہ تمام علوم سمٹ آتے ہیں جن کا تعلق کتاب و سنّت کی تعلیمات سے ہے۔ کتاب و سنّت کی تعلیمات پر ایک سرسری نظر سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ دینی و دنیوی امور پر مشتمل ہر وہ چیز جو دنیا و آخرت میں انسانیت کے لئے فائدہ مند اور نفع بخش ہے ان تعلیمات میں موجود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ حکمت اسرار و رموز دین الٰہی کی گرہ کشائی بھی ہے اور کتاب و سنّت کی تعلیمات سے موافق اور ان کے مطابق تمام علوم و فنون بھی ہیں یہ بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دقّت نظر سے مطالعہ کیا جائے۔ آپ کے ارشادات، فرمودات، تقاریر، اقوال، افعال و اعمال پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ قانون، تعلیم، حکومت، عدالت، معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب و تمدّن کی تشکیل اور اخلاق و کردار کی تعمیر سب حکمت کی عمدہ تفسیریں ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ تمام معاشرتی و سائنسی علوم جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں۔ اور وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے موافق ہیں وہ سب اسلامی ہیں اور ان کی تحصیل ضروری ہے۔

حکمت، روحِ دین ہے اسے موجودہ نظامِ تعلیم میں بی۔ اے، بی ایس سی، تک پڑھایا جائے۔ قرآن کی تعلیمات کی غایت اور ان کی روح پر مبنی نصاب تیار کر کے نظام تعلیم کے جملہ شعبہ جات کی گریجویٹ سطح پر نافذ کیا جائے۔ نصابِ حکمت کی ترتیب و تدوین میں امام غزالی، امام ابن تیمیہ، ابن خلدون، امام شاہ ولی اللہ، علامہ اقبال کی خدمات سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ میٹرک کی سطح تک تلاوت و تعلیم کتاب کے بعد گریجویٹ سطح تک تعلیم حکمت کے اہتمام کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس مجوزہ نظامِ تعلیم سے پیدا ہونے والے ڈاکٹر، انجینئر، ماہرین معاشیات، سیاسیات، معاشرت، عدالت، تعلیم پوری طرح کتاب و سنّت سے سرشار ہو کر اطراف و اکنافِ عالم میں پھیل جائیں۔ وہ جہاں کہیں جائیں اسلام کے مبلّغ ہوں۔ ان کے اخلاق و کردار خود سراپا دعوت اسلامی ہیں۔

یہی وہ طریق تعلیم ہے جو مغربی استعمار سے قبل اسلام میں رائج تھا۔ اس کے فارغ التحصیل تاجر بھی مبلغ تھے۔ اسوقت کروڑوں اسلام کے نام لیوا انہیں مبلغین اسلام کے مرہونِ منت ہیں۔

**تزکیۂ نفس** اسلامی نظام تعلیم و تربیت کا چوتھا بنیادی اصول تزکیۂ نفس ہے (دیزکیھم) تعمیرِ سیرت و کردار میں تزکیۂ نفس کو محوری حیثیت حاصل ہے۔ اذہان و قلوب کی تمام اخلاقی بیماریاں، نیتوں اور ارادوں کے تمام فسادات کا علاج تزکیۂ نفس ہے۔ سرکاری عدالتی، تعلیمی، سیاسی، معاشرتی، جملہ امراض اور ان کے انسداد و تدارک کا واحد حل تزکیۂ نفس ہے۔ عہدِ رسالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتہائی گمراہ، بدعنوان اور حیوانی صفات و اوصاف کی حامل قوم کو تزکیۂ نفس کے ذریعے دنیا کی سب سے بڑی با اخلاق، مہذب، متمدن اور صاحبِ سیرت و کردار قوم بنا دیا تھا۔ خلفائے راشدین نے اسلام کے نظامِ تعلیم اور اس کے بنیادی اصول تزکیۂ نفس کی بدولت ایران، عراق، شام، فلسطین، مصر، شمالی افریقہ کے انسانوں کو انسانیت سکھائی اور بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ پوری دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔

تزکیۂ نفس کا عمل نظامِ تعلیم کے تمام مدارج کا لازمی جزء ہونا چاہیئے۔ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ جو لوگ سمجھے بغیر قرآنی آیات کی تلاوت کرتے ہیں وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جو لوگ قرآن مجید کو ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں وہ تو یقیناً اس کا واضح اثر قبول کرتے ہیں۔ مگر تزکیۂ کا تعلق علم و تعلیم کی بجائے عمل سے زیادہ ہے۔ تلاوت اور تعلیم کتاب و حکمت کا تعلق تو تدریس سے ہے مگر تزکیہ کا تعلق خالصتاً عمل سے ہے۔ تزکیہ نفس میں معلّم کی ذات، سیرت و کردار اور نمونہ عمل بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ استاد ایک طرف قرآنی تعلیمات کی تدریس کے فرائض انجام دے اور دوسری طرف ان تعلیمات کا عملی مجسمہ بن کر اپنی سیرت و کردار کے اعلیٰ، عمدہ اور پاکیزہ نقوش طلبہ کے صاف اذہان و قلوب پر ثبت کرے۔ قرآن حکیم میں تطہر اور تزکیہ کی اصطلاحات ساتھ ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ تطہر کا مفہوم یہ ہے کہ رذائل سے اجتناب اور فضائل سے آراستگی معلّم کے فرائض منصبی کا لازمی جزء ہے۔ تزکیۂ نفس کا مطلب ترکِ دنیا ہرگز نہیں۔ دنیا میں تزکیہ نفس کی افضل و اکمل ترین مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی بھرپور زندگی آنحضرتؐ نے گزاری دنیا

ہیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا۔ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

**تربیت گاہیں** عہدِ نبوی کے نظامِ تعلیم و تربیت کا جو اجمالی خاکہ پیش ہوا اور اس کی روشنی میں موجودہ نظامِ تعلیم کی ترتیب و تدوین نو کے لئے جو تجاویز پیش ہوئیں ان پر عمل کی صورت میں آئندہ نسل کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے، مگر موجودہ نسل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس طرز پر مدوّن و مرتب نظامِ تعلیم کے لئے اساتذہ کہاں سے میسّر آئیں؟ انہیں تقاضوں کے پیشِ نظر یہ تجویز ہے کہ اس نظام کا نقطۂ آغاز تربیت گاہیں قرار دی جائیں۔ اسوقت ہر درجہ تعلیم میں تعیناتی سے قبل اساتذہ کو تربیت قبل از ملازمت دی جاتی ہے۔ اگر ان تربیت گاہوں کو فعال بنا کر ان کے نظامِ تعلیم و تربیت کو دینی و ملّی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک مختصر مدّت میں مطلوبہ معیار و قابلیت کے اساتذہ ہر سطحِ تعلیم پر میسّر آسکتے ہیں۔

اس مقصد کا حصول تین اہم امور پر منحصر ہے۔

**اوّل:** تربیت گاہوں کو تعلیم گاہوں پر ترجیح دی جائے۔ قابل ترین، دیانتدار، محنتی اور جوشِ عمل و عقیدہ سے سرشار اساتذہ کو تربیت گاہوں میں مقرر کیا جائے، اس صورت میں اگر ایسے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ مراعات بھی دینی پڑیں تو ان سے دریغ نہ کیا جائے۔ تاکہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ مستقبل کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض انجام دے سکیں۔

**دوم:** نصابِ تعلیم و تربیت میں کتاب و سنّت کی تعلیمات کو مرکزی و محوری حیثیت دی جائے انہیں مغربی فکر و فلسفہ کی ذیل کی حیثیت حاصل نہ ہو۔

**سوم:** تربیت اساتذہ پر مامور معلّمین کے انتخاب میں جہاں ان کی فنّی مہارت، علمی قابلیت، محنت اور جانفشانی کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں ان کے خود تزکیۂ نفس پر عمل پیرا ہونے اور اسوۂ حسنہ کو عملی طور پر اپنانے کو بھی لازمی شرط قرار دیا جائے۔

# مسئلہ وحدۃ الوجود

از قلم
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

قرآن مجید سے بہ نص قطعی الدلالۃ فقط وحدت معبود ثابت ہوتی ہے اور نجات اخروی کا مدار اسی پر ہے۔ وحدت وجود اور وحدت شہود جس کے صوفیہ قائل ہیں وہ اشارۃ النص سے ثابت ہوتی ہے اور یہ دونوں عقیدے ہرگز وحدت معبود کے مخالف نہیں ہیں۔ چنانچہ سید قطب مرحوم جو تصوف کے مخالف تھے، اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت سے وحدۃ الوجود کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو ان کی تفسیر سورۂ حدید)

حکمائے مشائین، بعض براہمہ، بعض جوگیہ اور بعض ویدانتی، جس وحدت وجود کو ثابت کرتے ہیں وہ دراصل وحدت وجود نہیں ہے۔ بلکہ حلول یا اتحاد کا نظریہ ہے۔ جو نصوص قرآنی کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ اسمیں اللہ کی مستقل ہستی باقی نہیں رہتی خارج میں جو تشخصات ہیں وہی اس کا وجود ہیں۔ یعنی کائنات سے الگ خدا کا کوئی مستقل بالذات وجود باقی نہیں رہتا۔

واضح ہو کہ صوفیۂ صافیہ، حلول اور اتحاد اور تجسیم تینوں عقیدوں کو کفر اور الحاد سمجھتے ہیں۔ صالح محمود شبستری "گلشن راز" میں صاف لکھتے ہیں:-

حلول و اتحاد ایں جا محال است
کہ در وحدت، دوئی عین ضلال است

مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان میں تعلیم یافتہ حضرات بھی بہت سے ایسے ہیں جو وحدت وجود کو حلول کا مترادف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حلول میں خدا غائب ہو جاتا ہے۔ ساری کائنات خدا بن جاتی ہے۔ جسطرح شربت

ہیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا۔ "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ"

**تربیت گاہیں** عہدِ نبوی کے نظامِ تعلیم و تربیت کا جو اجمالی خاکہ پیش ہوا اور اس کی روشنی میں موجودہ نظامِ تعلیم کی ترتیب و تدوین نو کے لئے جو تجاویز پیش ہوئیں ان پر عمل کی صورت میں آئندہ نسل کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے، مگر موجودہ نسل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس طرز پر مدوّنہ و مرتبہ نظامِ تعلیم کے لئے اساتذہ کہاں سے میسّر آئیں؟ انہیں تقاضوں کے پیشِ نظر یہ تجویز ہے کہ اس نظام کا نقطۂ آغاز تربیت گاہیں قرار دی جائیں۔ اسوقت ہر درجہ تعلیم میں تعیناتی سے قبل اساتذہ کو تربیت قبل از ملازمت دی جاتی ہے۔ اگر ان تربیت گاہوں کو فعال بنا کر ان کے نظامِ تعلیم و تربیت کو دینی و ملی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایک مختصر مدت میں مطلوبہ معیار و قابلیت کے اساتذہ ہر سطحِ تعلیم پر میسّر آسکتے ہیں۔

اس مقصد کا حصول تین اہم امور پر منحصر ہے۔

**اوّل:** تربیت گاہوں کو تعلیم گاہوں پر ترجیح دی جائے۔ قابل ترین، دیانتدار، محنتی اور جوشِ عمل و عقیدہ سے سرشار اساتذہ کو تربیت گاہوں میں مقرر کیا جائے، اس صورت میں اگر ایسے اساتذہ کو زیادہ سے زیادہ مراعات بھی دینی پڑیں تو ان سے دریغ نہ کیا جائے۔ تاکہ وہ پوری دلجمعی کے ساتھ مستقبل کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض انجام دے سکیں۔

**دوم:** نصابِ تعلیم و تربیت میں کتاب و سنّت کی تعلیمات کو مرکزی و محوری حیثیت دی جائے انہیں مغربی فکر و فلسفہ کی ذیل کی حیثیت حاصل نہ ہو۔

**سوم:** تربیت اساتذہ پر مامور معلّمین کے انتخاب میں جہاں ان کی فنّی مہارت، علمی قابلیت، محنت اور جانفشانی کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں ان کے خود تزکیۂ نفس پر عمل پیرا ہونے اور اسوۂ حسنہ کو عملی طور پر اپنانے کو بھی لازمی شرط قرار دیا جائے۔

# مسئلہ وحدۃ الوجود

از قلم
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

قرآن مجید سے بہ نص قطعی الدلالۃ فقط وحدت معبود ثابت ہوتی ہے اور نجات اخروی کا مدار اسی پر ہے۔ وحدت وجود اور وحدت شہود جس کے صوفیہ قائل ہیں وہ اشارۃ النص سے ثابت ہوتی ہے اور یہ دونوں عقیدے ہرگز وحدت معبود کے مخالف نہیں ہیں۔ چنانچہ سید قطب مرحوم جو تصوف کے مخالف تھے اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں "ھو الاول والآخر والظاھر والباطن" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت سے وحدۃ الوجود کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو ان کی تفسیر سورۂ حدید)

حکمائے مشائین، بعض براہمہ، بعض جوگیہ اور بعض ویدانتی، جس وحدت وجود کو ثابت کرتے ہیں وہ دراصل وحدت وجود نہیں ہے۔ بلکہ حلول یا اتحاد کا نظریہ ہے۔ جو نصوص قرآنی کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ اسمیں اللہ کی مستقل ہستی باقی نہیں رہتی خلق میں جو تشخصات ہیں وہی اس کا وجود ہیں۔ یعنی کائنات سے الگ خدا کا کوئی مستقل بالذات وجود باقی نہیں رہتا۔

واضح ہو کہ صوفیہ صافیہ، حلول اور اتحاد اور تجسیم تینوں عقیدوں کو کفر اور الحاد سمجھتے ہیں۔ صالح محمود شبستری "گلشن راز" میں صاف لکھتے ہیں:-

حلول و اتحاد ایں جا محال است
کہ در وحدت، دوئی عین ضلال است

مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان میں تعلیم یافتہ حضرات بھی بہت سے ایسے ہیں جو وحدت وجود کو حلول کا مترادف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حلول میں خدا غائب ہو جاتا ہے۔ ساری کائنات خدا بن جاتی ہے جسطرح شربت

میں شکر غائب ہو جاتی ہے۔ سارا پانی شکر بن جاتا ہے ۔

لیکن وحدت وجود میں خدا ہی خدا کا وجود برقرار رہتا ہے اور جسے ہم کائنات کہتے ہیں۔ یہ بذات خود کچھ نہیں ہے۔ صرف اس کی ذات کا جلوہ ہے یا اس کی صفات کا ظہور ہے۔

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تا بماہی سب ہے ظہور تیرا
ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا!

---

توحید ایک ایسا لفظ ہے جو وحدت معبود اور وحدت وجود اور وحدت شہود، تینوں معانی پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس حیثیت سے توحید اور وحدت وجود میں بھی فرق ہے یعنی وہ عام ہے۔ یہ خاص ہے۔ منطقی اصطلاح میں دونوں میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ پس مطلق توحید سے وحدت وجود سمجھنا غلطی ہے ۔

واضح ہو کہ وحدت وجود، انکشاف توحید کا نام ہے جس کا تعلق صرف مشاہدے سے ہے۔ چنانچہ جامیؒ فرماتے ہیں

"مغرور مشو بخود کہ توحید خدائے
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن"

اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ وحدت وجود، خالص علمی مسئلہ ہے جسے صوفیہ اپنی اصطلاح میں "ربط حادث بالقدیم" کہتے ہیں۔ اسلامی سیر و سلوک اور مشاہدۂ انوار و تجلیات سے تو اس کا تعلق ہے مگر یہ علمی مسئلہ مدار نجات ہرگز نہیں ہے۔ کروڑوں مسلمان ایسے ہیں جو اس مسئلے کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں، اس کے باوجود ان کے ایمان میں کوئی شک نہیں ہے۔

"ربط حادث بالقدیم" کا مطلب یہ ہے کہ ممکنات یا مخلوقات کو واجب الوجود (اللہ) سے کیا نسبت یا تعلق ہے؟

۱۔ متکلمین یہ کہتے ہیں کہ محض نسبت خلق ہے یعنی اس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور

خالق و مخلوق میں مغائرتِ تامہ ہے۔

(۲) حکمائے مشائین اور براہمہ وجوگیہ (ویدانتی) کی تحقیق یہ ہے کہ باہم نسبت عینیّت ہے یعنی وہ ذاتِ واحد پہلے اجمال میں تھی، یہ کائنات اس کی تفصیل ہے۔ یعنی اب یہی عالم اس کی ذات ہے اور اس کا وجود ہی ہمارا وجود ہے۔ جب تفصیل ہوگی تو اجمال کہاں؟ اس کی مثال یہ لوگ تخم اور درخت سے دیتے ہیں کہ ہر درخت کی اصل تخم ہے۔ اسی تخم سے تنہ، شاخوں، پتّیوں، پھولوں اور پھلوں کی نمود ہوئی۔ سب کے نام جدا ہیں مگر حقیقت سب کی ہے۔

اب وہ تخم اپنی اصلی یا تخمی حالت میں باقی نہیں رہا بلکہ تمام و کمال صورتِ شجریہ میں ظاہر ہوگیا۔ (اسی کو اصطلاح میں حلول کہتے ہیں)

(۳) صوفیہ اسلامیہ کا مسلک:-

حادثات (کائنات) اور قدیم (اللہ تعالیٰ) کے درمیان ظہور یا تجلّی کی نسبت ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ مستقل بالذات موجود ہے۔ تمام اشیائے کائنات اسی کی ذات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اگر ہم اس کی ذات سے قطع نظر کرلیں تو تمام اشیا معدوم ہیں۔ پس یہ امتیازِ اشیاء باخود ہا نیز اُس ذاتِ مستقل سے بوجوہِ تشخّصات ہے۔ جن کو اصطلاح میں وجوداتِ خاصہ کہتے ہیں اور اس کی مثال جیسے سیاہی اور حروف و نقوش۔ یعنی اصل تمام حروف کی وہی سیاہی ہے مگر حروف، عین سیاہی نہیں بلکہ سیاہی سے ناشی یا پیدا ہوئے ہیں۔ پس باعتبارِ حقیقتِ ہستی، فی الجملہ عینیّت ہے اور باعتبارِ ظہور، وہی نسبت صدور و مغائرت ہے۔

پس صوفیہ کے مذہب و مسلک کو حکماء وجوگیہ و براہمہ و ملاحدہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں عینیّتِ محضہ ہے۔ لیکن یہاں عینیّت کے ساتھ ساتھ وجوداتِ موجوداتِ خاصہ بھی ہیں۔

اربابِ حلول کے یہاں وجودِ باری اب مستقل طور پر باقی نہیں رہا (جس طرح شربت میں چینی کا وجود باقی نہیں رہتا) وجہ یہ ہے کہ اربابِ حلول کے نزدیک وجود، کلّی طبعی ہے۔ (جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا) لیکن صوفیہ کے نزدیک وجود، جزئی حقیقی ہے جو فردِ واحد میں منحصر ہے۔ اسی فرد کو ہم اللہ کہتے ہیں۔ عارفِ جامیؒ فرماتے ہیں:-

آں کاں حُسن بُود نبود از جہاں نشاں !!
الآن اِن عرفت علی ما علیہ کان
اعداد و کون و کثرتِ صورت نمائش است
فَالکُل واحدٌ یتجلی بکل شان !

یہ کائنات فی الجملہ ایک ہی ہے جو مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔

"الآن اِن عرفت" پر خوب غور کرو کہ اس عالم ظہور سے اس پاک وجود کو اپنی ہستی کے بعینہٖ بقاء و کمال میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ بس اس قدر کہ ان العالم اعراضٌ مجتمعۃٌ فی عین واحدٍ یہ عالم جوہر نہیں ہے بلکہ مجموعہ اعراض ہے جو ایک ذات میں مجتمع ہو گئے ہیں اور وہ عینِ واحد وہی ذات ہے جو وجود منبسط ہے۔

شعر ثانی کے دوسرے مصرع پر بھی غور کرو یعنی فالکل واحدٍ ..... الخ واحد یا ایک ابتدائی عدد ہے جو بذات خود مستقل ہے۔ پھر اس سے دو، تین، چار اور پانچ ہیں مگر وہ ایک، ان سب میں شامل ہے اور ان سب سے جدا اس کا ایک وجودِ مستقل بھی ہے۔ اسی طرح وہ وجود تمام کائنات میں بھی ہے اور فی نفسہٖ موجود مستقل بھی ہے اور اس میں نہ کمی ہے نہ بیشی

آثارِ تعینات چوں یافت حکے !! کثرت ہمہ وحدت است بے ہیچ شکے !
چوں صورت صفر شد نہاں از رقمت بنگر کہ دہ و صد و ہزار است یکے

(جامیؒ)

"ھذا طورٌ وراءَ طورِ عقول المتوسطہ" (ملا حسن)

اب رہی یہ بات کہ صوفیوں کو اس مسئلے کی تحقیق کی ضرورت کیوں پیش آئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ صوفیہ کا مسلک یہ ہے کہ شریعت فقط قیل وقال کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے عملی پہلو سے استفادے کا نام بھی ہے اور جب ہم نے اخلاص عمل اختیار کیا تو وہ انوار اور تجلیات جو صحابۂ کرامؓ پر منکشف ہوتی تھیں ہم پر بھی ہونے لگیں۔

جب ہم نے بفحوائے ارشاد نبویؐ "ان تعبد ربك كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" رؤیت ایزدی کا مراقبہ کیا اور بچشم حقیقت اس کا مشاہدہ کیا اور کبھی اسے اپنا دیکھنے والا پایا تو ان تجلیات اور مشاہدات نے ہمیں اپنی

نسبت دریافت کرنے پر متوجہ کیا: پس ہم نے اس کے کلام کی طرف توجہ کی کما قال فی القرآن :—

۱۔ واللہ خلقکم وما تعملون اور

۲۔ ذلکم اللہ ربکم خالق کل شیئ

پر غور کیا تو ہم اپنی نسبت صدور اور اس کی معبودیت کو موجب نجات سمجھنے لگے مگر تجلیات عرفانی نے ہمارا قدم ذرا آگے بڑھایا تو ہم نے ان آیات قرآنی میں تدبر کیا

۱۔ وھو معکم اینما کنتم

۲۔ وفی انفسکم افلا تبصرون

۳۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید

۴۔ سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتّٰی یتبیّن لھم انہ الحق۔

۵۔ اولم یکف بربّك انہٗ علٰی کل شیءٍ شھید

۶۔ الا انّھم فی مریۃٍ من لقآءِ ربھم ط
الا انّہٗ بکلّ شیءٍ محیط ط

۷۔ وما رمیت اذ رمیت ولٰکنّ اللہ رمٰی ط

۸۔ ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ ط ید اللہ فوق ایدیھم

۹۔ اللہ نور السمٰوٰت والارض......الخ

۱۰۔ ھو الذی فی السماءِ الٰہٌ وفی الارض الٰہٌ

۱۱۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

۱۲۔ ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیءٍ علیمٌ ط

تو صوفیہ ان آیات پر غور کرنے کے بعد وحدتِ وجود کے اعتقاد پر مجبور ہو گئے اور ان پر منکشف ہو گیا کہ شریعت کا اصلی عرفان یہی ہے اور اسی عرفانِ وحدتِ وجود سے صحابۂ کرام، اولیائے عظام اور مشائخ طریقت مقامات اور مدارجِ عُلیا تک پہنچے۔

امام غزالیؒ نے کیمیائے سعادت، اربعین اور احیاء العلوم میں توحید کے

چار مدارج بیان کئے ہیں:۔

ﺍ۔ توحیدِ لسانی: صرف زبان سے توحید کا اقرار کرنا (یہ منافقین کا طریقہ ہے)

ب۔ توحیدِ قلبی: سچے دل سے توحید کا اقرار کرنا (اور یہ مومنوں کا طریقہ ہے)

ج۔ توحیدِ کشفی: نورِ حق کے ذریعے سے بطور کشف اس کا مشاہدہ کرے۔ یعنی تمام اشیائے کائنات کو وحدت سے صادر شدہ دیکھے (اور یہ مقربین کا درجہ ہے)

(د)۔ توحیدِ حالی: ساری کائنات میں اسے وحدت ہی وحدت نظر آئے (اور یہ صدیقین کا مرتبہ ہے) اور حضرت صدیق اکبرؓ اس جماعت شریفہ کے پیشوا ہیں۔

ثبوت اس بات کا یہ ہے کہ وفاتِ رسول اللہؐ سے سب صحابہ غمگین اور محزون ہو گئے تھے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ کے قلبِ مطہر میں نہ غم تھا نہ حزن، نہ اضطراب تھا نہ انتشار۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کی نگاہ میں غیر اللہ کی ہستی فنا ہو چکی تھی۔ انہیں ہر طرف اللہ ہی اللہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ آپؓ فرماتے ہیں "میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر اس سے پہلے اس میں اللہ کو دیکھا"۔

اسی لئے حضورؐ نے فرمایا:

"اگر کوئی شخص مُردے کو زمین پر چلتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے تو وہ ابوبکرؓ کو دیکھ لے"

باز آمدم بر سرِ مطلب، ہزاروں اکابر اولیائے اُمت، وحدت وجود کے قائل تھے ظاہر ہے کہ یہ تمام بزرگانِ دین، ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً سرآمد اولیائے سلسلہ نقشبندیہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ فرماتے ہیں:

کثرتِ ایں نقشہا عرضِ تجلی ہائے اُوست
در دو عالم غیرِ یک نقاش کس موجود نیست

(۱) متکلمین تو بجز نسبتِ ظہورِ خلق و صانعیت و مصنوعیت اور کچھ ثابت نہیں کرتے۔ اور اس کی مثال میں "ہیچو نسبتِ کوزہ و کلال" کہا کرتے ہیں۔

(۲) صوفیہ میں دو جماعتیں ہیں:۔

ﺍ۔ حضرت علاؤ الدولہ سمنانیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ حق اور خلق کے درمیان تجلّی کی نسبت ہے۔ یعنی نسبتِ اصل با ظلّ خویش۔

ب۔ شیخ اکبرؒ، صدر الدین قونوی، عراقی، جامیؒ، شیخ امان اللہ پانی پتی، عبد القدوس

گنگوہیؒ، شیخ محبّ اللہ الہ آبادی اور مولانا فضل حق خیرآبادیؒ فرماتے ہیں کہ ظہور کی نسبت ہے یعنی ظہور وحدت در کثرت ہمچو ظہور آب در امواج و ژالہ وحباب۔ اور یہ کثرت اعتباری مزاحم وحدت حقیقی نہیں ہے۔

حضرات وجودیہ وشہودیہ کا اختلاف چنداں اہم نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں

"لا فرق بینهما الا فرقاً ضعیفاً.........الخ"

حضرات شہودیہ نے خود لکھا ہے کہ:

"ظلّ را در حقیقت، حقیقتے دیگر غیر از اصل او نیست ہماں اصل در قرینۂ ثانیہ ظہور کردہ، خود را ظل وانمودہ است"

کثرت ظلی مخل وحدت حقیقی نہیں ہے۔ بہرحال وجود تو ایک ہی قرار پاتا ہے۔ ہاں دونوں میں اتنا فرق بہرحال ضروری ہے کہ

ا۔ ارباب شہودیہ کے نزدیک یہاں پر حمل بالمواطات صحیح نہوگا۔ یعنی یہ نہیں کہا جائے گا کہ دھوپ عین آفتاب ہے اور آفتاب عین دھوپ ہے۔ بالفاظ دگر، یہاں حمل بالاشتقاق صحیح ہوگا۔ لیکن

ب۔ حضرات وجودیہ کے نزدیک یہاں حمل بالمواطات بالکل صحیح اور درست ہوگا۔ یعنی دھوپ عین آفتاب ہے جس طرح موج عین بحر ہے۔ چنانچہ خلاق المعانی حضرت میرزا بیدلؒ فرماتے ہیں:

از موج تواں شنید اسرار محیط
در کام اگر کشد زبان خود را

زسیر عالم دل غافلیم ورنہ حباب !!
سرے اگر بگریباں فرد برد، دریاست

نکتہ توحید بشنو از نیاز بے نیاز
کیں ہمہ نقش دو عالم نیست الّا نقشبند !

آخر میں اس بات کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود فلسفے میں سب سے مشکل مسئلہ ہے۔ تعبیر یا تقریر میں ذرا سی بھول چوک ہو جائے تو کفر یا الحاد لازم

آجاتا ہے۔ اس لئے جو لوگ اس مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں، انہیں میں یہ مشورہ دونگا کہ پہلے وہ منطق، فلسفہ اور کلام یہ تینوں فنون کسی ماہر فن سے پڑھ لیں۔ پھر فصوص الحکم کسی ماہر فن سے سبقاً سبقاً پڑھیں اور جب تک ایک بحث پورے طور سے سمجھ میں نہ آجائے دوسری بحث شروع نہ کریں۔ ایسا کرنا محض تضیع اوقات ہوگا۔ یہ دونوں مشورے میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر دے رہا ہوں۔ اکبر الہ آبادی مرحوم کے اس دربے بہا پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں ؎

سالک کو دم تیغ ہے قطع رہ توحید
دو ہو گیا اک آن میں، چوکا جو ذرا بھی

نوٹ: اس شعر میں لفظ "دو" کی معنویت میری تحسین سے بالاتر ہے۔

اگرچہ مشائین واجب الوجود کو کلی طبعی مانتے ہیں لیکن صوفیۂ صافیہ کے نزدیک وہ جزئی حقیقی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اس عالم میں بجز ایک ذات اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ذات بسیط ہے اور وہی اصل وجود ہے۔ لیکن وہ ذات نہ تو ایسی کلی ہے جو حقیقۃً کثرت کو قبول کرے اور نہ ایسی جزئی ہے کہ کثرت کو قبول ہی نہ کرے۔ بلکہ وہی ایک ذات الگ الگ اعتباری صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کی ذات وہ سرچشمہ ہے جس سے لاانتہا تعینات کا صدور ہوتا رہتا ہے اور ان تعینات پر جو ایک ہی ذات سے ظاہر ہوتے ہیں، مختلف احکام مترتب ہوتے ہیں۔ پس جو متعین شے اپنے پورے تعین کے ساتھ موجود ہے، وہی ممکن ہے اور جو اس سے بالکل معرا ہے وہ واجب ہے۔ پس علم کا مطلب اسکی ذات کا علم ہے۔ کیونکہ اس کی ذات ممکنات سے بالکل مغائر نہیں ہے بلکہ اعتباری مغائرت رکھتی ہے۔

# المضاربۃ والمزارعۃ

مولانا سید حامد میاںؒ

یہ مقالہ مولانا موصوف نے دوسرے سالانہ محاضرات قرآنی کے موقع پر ارسال فرمایا تھا۔ (ادارہ)

اردو میں اسے مضاربت لکھتے اور بولتے ہیں۔ عربی میں اسے مُقارَضہ اور مُعامَلہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شریک کا روپیہ ہو اور دوسرے شریک کی محنت ہو۔

تجارت کے طریقوں میں مضاربت کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب اس طریقہ سے تجارت کرتے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جائز قرار دیا۔ وہ جسے روپیہ دیتے تھے اس سے یہ شرطیں طے کر لیا کرتے تھے کہ وہ مال لے کر بحری سفر نہ کرے۔ مال کسی وادی میں نہ اتارے (کیونکہ وادی نشیب میں ہوتی ہے اور پہاڑی علاقہ میں کہیں دور بارش ہوئی ہو تو اچانک پانی بے خبری میں آکر سامان وغیرہ سب بہالے جاتا ہے۔) ایک شرط یہ طے کیا کرتے تھے کہ میرا مال جانور خریدنے کے کام میں نہ لانا۔ اگر تم نے ایسا کیا اور پھر کوئی نقصان ہوا تو تم پر ضمان آئے گا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرطیں درست قرار دیں۔

مضاربت کے ثبوت کی دوسری دلیل اجماع صحابہؓ ہے۔ سیدنا عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وعنہم نے مضاربت پر مال دیا ہے۔ اور ان حضرات نے یتیم بچوں کے مال مضاربت پر دیئے ہیں۔

یہ سب کچھ سب صحابہؓ کرام کے سامنے ہوتا رہا۔ اور کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی اس لئے اسے اجماع کہا گیا ہے۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ اور عبیداللہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے عراق گئے۔ ان دنوں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ وہاں امیر تھے۔ انہوں

نے ان سے فرمایا کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں آپ کو پیش کرتا۔ میرے پاس مرکزی بیت المال بھیجنے کے واسطے روپیہ رکھا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ اس کا یہاں سے سامان خرید لیں۔ مدینہ منورہ پہونچ کر فروخت کر کے روپیہ بیت المال میں داخل کر دیں اور نفع آپ رکھ لیں۔ جب یہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سُن کر فرمایا کہ روپیہ کسی کا بھی نہیں ہے۔ یہ روپیہ بیت المال (اسٹیٹ بنک) کا ہے اور یہ سب مسلمانوں (عوام) کا ہے۔ اس لئے روپیہ اور نفع سب بیت المال میں داخل کر دو یہ نفع بھی سب مسلمانوں (عوام) کا ہی رکھو۔ اس پر عبداللہؓ خاموش ہو گئے اور عبیداللہ نے عرض کیا کہ اس میں ہماری محنت اور ذمہ داری بھی شامل ہے کہ اگر یہ ہم سے تلف ہو گیا ہوتا تو ہم اس کے ذمہ دار ہوتے اور ضمان دیتے۔ اور صحابہ کرام بھی موجود تھے انہوں رائے دی کہ اے امیر المومنین! آپ ان دونوں کا مضاربت کی طرح نفع میں حصہ کر دیجئے آدھا نفع ان کو اور آدھا بیت المال کو دیدیجئے۔ آپ نے اس صورت پر عمل کرنے کی اجازت دیدی۔

غرض جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر ابتک ہر دور میں اس صورت پر عمل چلا آرہا ہے اور کبھی کسی نے اسے منع نہیں کیا۔ اور اجماع امت جس زمانہ میں بھی ہو حجت ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ ہر دور میں پایا جا رہا ہو۔ نیز عقلی طور پر بھی ظاہر ہے کہ تجارت کی اس صورت کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس مال ہوتا ہے اور تجارت کی اہلیت نہیں ہوتی اور دوسرے شخص کا ذہن تجارتی ہوتا ہے لیکن اس کے پاس مال نہیں ہوتا تو اس صورت کے مشروع ہونے میں دو ضرورتمندوں کی ضرورت رفع ہوتی ہے۔ اور حق تعالیٰ نے خرید و فروخت کا سلسلہ کے مصالح کے لئے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے ہی کے لئے رکھا ہے۔

(بدائع الصنائع ص ۷۹ ج ۶)

اس تجارتی معاملہ کو طے کرنے کے لئے شریعت نے جو طریقہ بتلایا ہے اسمیں کچھ شرائط رکھی ہیں۔ اگر ان شرائط کے مطابق ہوگا تو جائز ہوگا ورنہ ناجائز۔

ایک شرط یہ ہے کہ کاروبار میں جتنا روپیہ لگانا ہے وہ طے ہو اور دوسرے شخص کو صاف طرح بتلا دیا جائے کہ میں اتنا روپیہ دوں گا۔

(۲) اور روپیہ دے بھی دیا جائے تاکہ کاروبار چلنے لگے۔ ورنہ معاملہ فاسد شمار ہوگا۔

(۳) نفع کی تقسیم بھی طے ہو کہ روپے والے کو کتنا اور محنت والے کو کتنا نفع ملے گا۔ اگر مقدار نفع طے نہ ہوئی۔ اگر صرف اتنی ہی بات کی گئی ہے کہ نفع ہم دونوں کا ہوگا تو ہر صورت میں نفع آدھا آدھا ہو جائے گا۔

(بدائع الصنائع ج ۶ ص ۸۵)

(۴) اگر نفع کی تقسیم کے لئے یہ طے کیا کہ نفع میں مثلاً ایک ہزار میرے (صاحب مال کے) اور باقی تمہارے (یعنی محنت کرنے والے کے) یا اس کے برعکس تو یہ درست نہیں۔ معین رقم طے نہیں کی جاسکتی۔ اس سے عقد فاسد ہو جائے گا۔ نفع معین کرنے کا یہ طریقہ ہوگا کہ روپیہ دینے والا اپنا ایک حصہ رکھ لے۔ نفع کا چوتھائی یا تہائی یا نصف وغیرہ جو بھی دونوں میں طے ہو جائے۔ اگر نفع ہوگا تو کام کرنے والا اسمیں حصہ کا حقدار ہوگا۔ اور نفع نہ ہوا تو نہیں۔

(۵) یہ شرط بھی درست نہیں ہے کہ اگر نفع نہ ہوا تب ہم آپ کو (کام کرنے والے کو) اصل مال میں سے اتنا دیں گے۔ اس سے بھی مضاربت میں فساد آجاتا ہے۔

(۶) اگر یہ طے کیا کہ نقصان کی صورت میں ــــ نقصان بذمۂ کارکن ہوگا ــــ یا یہ طے کیا کہ نقصان میں دونوں (پیسے والا اور کام کرنے والا) شریک ہوں گے تو یہ بھی غلط ہے۔ نقصان کی صورت میں صرف روپیہ دینے والا شریک ہی اسے برداشت کرے گا۔

(۷) اگر صاحب مال نے یہ طے کیا کہ میں خود یا میرا فلاں آدمی تمہارے ساتھ کام کیا کرے گا تو بھی مضاربت نہیں رہے گی (کیونکہ یہ صورت مضاربت کی نہیں ہوتی۔ مضاربت میں ایک کا روپیہ اور دوسرے کا کام ہوا کرتا ہے۔)

(۸) مذکورہ بالا ممنوعہ شرائط میں سے اگر کوئی شرط رکھ لی ہو تو مضاربت ختم ہو جائے گی اور یہ فیصلہ دیا جائے گا کہ کام کرنے والا شخص ملازم ہے۔ اس شخص کو صاحب مال اتنی تنخواہ دینے کا ذمہ دار ہے۔ جتنی رواجاً اس جیسے ملازم کی ہوا کرتی ہے۔ اور نفع نقصان صاحب مال کا ہوگا۔ البتہ اگر تنخواہ کی رقم زیادہ بنتی ہو اور نفع کم ہوا ہو تو یہ فیصلہ دیا جائے گا کہ نفع ہی دے دیا جائے۔ اور آئندہ کے لئے وہ از سرِ نو معاملہ طے کرکے کام کریں۔ یا معاملہ ختم کردیں۔

(۹) صاحب مال اگر شروع ہی میں معاملہ فسخ کرنا چاہتا ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ کام کرنے والے ساتھی نے سامان خرید لیا ہے یا نہیں۔ اگر اس نے سامان خرید لیا ہو تو اب صاحب مال معاملہ کو فسخ نہیں کر سکتا اور اگر سامان نہ خریدا ہو تو فسخ کر سکتا ہے۔

(۱۰) مضاربت کے طریقہ پر تجارت غیر مسلم کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے۔

## مُزارَعَہ

یعنی زمین کھیتی بونے کے لئے بٹائی پر دینی۔ یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ امام اعظمؒ کے اس فتویٰ پر امام شافعی رحمہ اللہ کا عمل بھی رہا ہے۔

لیکن امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہر دو جلیل القدر شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمدؒ سے جائز قرار دیتے ہیں۔

جو حضرات مزارعت کو جائز قرار دیتے ہیں ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خیبر کا علاقہ فتح کیا تو وہاں کی یہودی آبادی کو آپؐ نے وہیں رہنے دیا اور زمین جو مسلمانوں کی ہو چکی تھی انہیں بٹائی پر دے دی۔ مزارعت کا نام مُخابَرہ۔ (خیبر والا معاملہ) بھی ہے۔

لیکن امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کے ساتھ آپ کا یہ معاملہ مزارعت کے طریقہ نہ تھا۔ بلکہ یہ ان سے خراج وصول کرنے کی ایک صورت تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا تھا:۔

نُقِرُّکُمْ مَا اَقَرَّکُمُ اللّٰہ — ہم تمہیں جب تک خدا چاہے گا اس صورت پر قائم رکھیں گے۔

آپؐ نے اس کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں فرمائی تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ خراج ہی تھا (اسے امام اعظمؒ نے خراجِ مُقاسَمَہ کا نام دیا ہے) کیونکہ اگر یہ مزارعت ہوتی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدت ضرور مقرر فرما دیتے۔ مدت کے تعین کے بغیر کسی کے نزدیک بھی مزارعت ٹھیک نہیں سمجھی گئی۔ نیز کسی بھی حدیث میں یہ نہیں آیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے خیبر کے یہودیوں سے جزیہ لیا ہو۔ اگر خیبر کی زمین یہودیوں کو بٹائی پر دی گئی ہوتی تو جزیہ ضرور لیا گیا ہوتا۔ اس

سے مزید واضح ہو رہا ہے کہ زمین یہودیوں کو بٹائی پر نہ دی گئی تھی بلکہ جزیہ وصول کرنے کا یہ طریقہ اختیار فرمالیا تھا۔ اسی میں جزیہ داخل تھا۔ اسی کا نام خراج مُقاسَمہ ہے۔ اور مسلمانوں کے آپس کے معاملہ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے۔ نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن المخابرۃ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ (مزارعت) سے منع فرمایا۔ (یہ حدیث امام بخاریؒ نے بھی تحریر فرمائی ہے۔ بخاری ج ۱ ص ۳۲۰)

البتہ امام اعظمؒ اس صورت کو جائز قرار دیتے ہیں کہ سفید زمین کرایہ پر دے دیجائے۔ یہی حضرت ابن عباس کا فتویٰ تھا (رضی اللہ عنہما)

اِنَّ اَمْثَلَ مَا اَنْتُمْ صَانِعُوْنَ اَنْ تُسَاْجِرُوا الْاَرْضَ الْبَیْضَاءَ عَنِ السَّنَۃِ اِلَی السَّنَۃِ۔ (بخاری ص ۳۱۵ ج ۱)

لیکن فتویٰ صاحبین (امام ابو یوسفؒ و محمدؒ) کے قول پر ہی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے تعامل (عمل) کو اہمیت دی۔ کیونکہ تعامل صحابہ و تابعین خود بڑا وزن رکھتا ہے۔ وہ دلیل جواز ہے۔ نیز اس میں سہولت زیادہ ہے۔ اس لئے کہا جائے گا کہ افضل تو یہی صورت ہے کہ سفید زمین کرایہ پر دیدی جائے۔ لیکن جائز یہ بھی ہے کہ بٹائی پر دیدی جائے۔

مزارعت یعنی بٹائی پر زمین دینے کے تفصیلی احکام تو کتب فقہ میں ہیں لیکن مزارعت کے آسان آسان کچھ احکام (قاعدے قانون) یہاں بھی درج کر رہا ہوں۔

(۱) دونوں میں یہ طے ہونا چاہیئے کہ کیا بویا جائے گا۔

(۲) مزارع کھیتی باڑی ہی کر سکتا ہے درخت نہیں بو سکتا۔

(۳) پیداوار میں حصہ ہر ایک کا صاف معین ہوگا۔ چوتھائی تہائی نصف جو بھی ہو۔

(۴) ہر دو کا حصہ اسی زمین سے پیدا شدہ کھیتی میں لیا دیا جائے گا۔ کیونکہ بات ہی اس زمین کی اور اس کی پیداوار کی ہے۔

(۵) زمین قابل کاشت ہو۔ بنجر زمین مزارعت پر نہیں دی جاتی۔

(۶) زمین اور اس کی حدود متعین ہوں۔

(۷) زمین اس مدت میں فقط مزارع کے عمل دخل میں رہے گی۔ مالک دخل نہ دے گا۔

(۸) اگر ٹریکٹر اور بیج مالک زمین نے دینے طے کئے ہیں تو بھی جائز ہے اور اگر مالک زمین

فقط زمین دے رہا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ اور اگر زمین اور بیج مالک کے اور ٹریکٹر یا بیل اور ہل مزارع کے ہوں تو یہ بھی درست ہے۔

(۹) اگر زمیندار ٹریکٹر دے رہا ہے اور کاشت کار بیج دے رہا ہے تو اس صورت میں امام ابو یوسفؒ و محمدؒ (صاحبینؒ) میں بھی اختلاف ہے۔ امام محمدؒ منع کرتے ہیں اور امام ابو یوسفؒ اسے جائز فرماتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہ صورت اختیار نہ کی جائے۔

(۱۰) کچھ بیج مالک زمین اور کچھ کاشت کار دے یہ بھی درست نہیں۔

(۱۱) اگر ایک شخص نے زمین دی ایک نے بیج دیئے ایک نے ٹریکٹر اور چوتھے نے کام کیا تو یہ جائز نہیں۔ اسی طرح کا واقعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔ تو آپؐ نے اسے غلط قرار دیا تھا۔

(۱۲) ٹریکٹر۔ یا۔ ہل اور بیل۔ مہیا کرنے کی شرط کسی طرف سے بھی دوسرے پر لازمی نہیں قرار دی جائے گی۔ اس پر کوئی بھی فریق دوسرے سے نہیں جھگڑ سکے گا۔ اور مزارع مالک زمین کو پابند نہیں کر سکتا۔

(۱۳) مدت مزارعت بھی طے کرنی چاہیئے۔ اس کی ابتداء بھی اور انتہا بھی۔ بہتر یہی ہے۔

(بدائع الصنائع ج ۶۔ ص ۱۷۵ تا ۱۸۲)

# حسّی معجزات — ایک توجیہہ

از قلم:
ڈاکٹر عبدالخالق
(صدر شعبہ فلسفہ، جامعہ پنجاب)

حسّی معجزات بنیادی طور پر اللہ تعالےٰ کی آیات اور اس کی فعلیت کے مصدقہ مظہر ہیں جن کی تکذیب خود اللہ تعالےٰ کو جھٹلا دینے کے مترادف ہے۔ تاہم ثانوی طور پر ان کا ایک زمانی و مکانی پہلو بھی ہے جس کے لحاظ سے یہ ان واقعات پر مشتمل ہیں جو قوانین فطرت میں دخل انداز ہو کر ان کے عمل کو عارضی طور پر روک دیتے ہیں۔ زیر نظر بحث کا تعلق معجزات کے اسی موخر الذکر پہلو سے ہے۔

اسلامی فکر کی تاریخ میں ہمیں حسّی معجزات کے بارے میں دو متناقض قسم کے نظریات ملتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کائنات میں جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب کے سب بلاواسطہ اور براہ راست اللہ کی مشیت اور اس کے ارادے سے ہوتے ہیں۔ کوئی ایسے اصول و قوانین موجود نہیں ہیں جو فطرت میں از خود کارفرما ہوں اور جن کی معروضی نوعیت کو سائنسی تجرباتی تحقیق سے دریافت کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر اگر آگ میرے ہاتھ کو جلاتی ہے یا پانی میری پیاس کو بجھا دیتا ہے تو آگ کی حدت اور میرے ہاتھ کے جل جانے کے درمیان اور پانی پینے اور پیاس کے بجھ جانے کے درمیان کوئی ایسا باہمی تعلق نہیں ہے جسے ہم علت و معلول کا رشتہ کہہ سکیں۔ دراصل خدا خود اپنے ذاتی ارادے سے میرے ہاتھ میں جلنے کی کیفیت

یا میرے عضو بدن پیاس کے بجھ جانے کا احساس پیدا کر دیتا ہے اسی طرح کائنات کا ہر سانحہ چاہے وہ کسی سطح پر رونما ہو رہا ہو خود خدا ہی کے ارادے کا مرہون منت ہے ۔گویا تمام معجزات معمول کے عین مطابق اور سراسر فطری ہیں اور تمام فطرت کلیتہً معجزات پر مشتمل ہے ۔ یہ بالخصوص فرقہ اشاعرہ کا نظریہ تھا جنہوں نے قرآنی آیت إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کی خالص لفظی تعبیر کو قبول کر لیا تھا ۔ ان کا عمومی موقف یہ تھا کہ اگر ہم کائنات میں موجود ارادی یا غیر ارادی فعلیتوں کو تسلیم کر لیں تو اس سے خدا کے قادر مطلق ہونے پر حرف آنے کا اور اس کی طاقت محدود ہو جائے گی ۔

اس فلسفہ علت و معلول کے بالکل برعکس نظریہ یہ ہے کہ قوانین فطرت میں ریاضیاتی اور منطقی لزوم کی سی حیثیت موجود ہے ۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالٰے وعدہ خلافی نہیں کرتا ۔اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی فعل قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قوانین اُس کے عملی عہد کی حیثیت رکھتے ہیں معتزلہ نے اسی نظریے کو اختیار کیا تھا ۔ جدید مسلم فکر میں سر سید احمد خاں کو اس نقطۂ نظر کا پیش رو خیال کیا جاتا ہے اُن کی رائے یہ ہے کہ خدا جو قوانین بھی چاہے بنا سکتا ہے لیکن ایک دفعہ جب وہ انہیں بنا دیتا ہے تو پھر وہ مستقل طور پر نافذ العمل ہو جاتے ہیں ۔ سر سید کی یہ رائے دراصل انیسویں صدی کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دیکھی جانی چاہیئے وہ دور عمومی طور پر مادیت کے عروج اور فطری قوانین کی جبریت پر ایمان و اعتقاد کا دور تھا ۔

اِن دو نقطۂ ہائے نظر کے درمیان عوام الناس کا نظریہ یہ ہے کہ عام حالات میں تو قوانینِ فطرت موثر رہتے ہیں لیکن جب خدا چاہے ان میں دخل انداز ہو کر کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر کر سکتا ہے جسے مذہب کی زبان میں معجزہ کہتے ہیں اور جو متعلقہ شخص کی عظمت کی دلیل سمجھا جاتا ہے ۔ سطور ذیل میں اسی عمومی موقف کی فلسفیانہ توجیہ کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ اللہ تعالٰے کا بھرپور عمل دخل بھی ثابت ہو جاتا ہے اور قوانین فطرت کی ساکھ

نہیں ہے لیکن تمام بڑے بڑے مذاہب ان سے ماورائی رُوح اور اس کے درجات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کوئی غیر معمولی واقعہ جو رُوحانی قوت کے ذریعے کسی پیغمبر یا ولی سے سرزد ہوتا ہے وہ کوئی فوق الفطرت چیز نہیں ہوتی — بشرطیکہ ہم لفظ فطرت کو وسیع ترین مفہوم میں ساری کائنات پر محیط سمجھیں — ہوتا صرف یہ ہے کہ ایک برتر سطح کی علیّت ادنیٰ سطح کے وجود میں تعلیلی نتائج کو بدل دیتی ہے۔ اب اگر ہمارا خدا ایک شخصی خدا ہے جیسا کہ یقیناً ہے اور قرآن کا بھی واضح طور پر یہی موقف ہے تو پھر الوہیت کی سطح پر بھی ایک خاص نوع کی علیّت موجود ہونی چاہیئے جو اپنے تمام ماتحت طبقات پر اثر انداز ہو کر ان میں تبدیلی پیدا کر سکے۔ جس طرح حیات مادہ کے افعال بدل سکتی ہے اور ذہن حیات کے اعمال میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے اسی طرح ایک شخصی خدا میں بھی یہ قدرت اور قوت ہونی چاہیئے کہ برتنے کو اپنے وسیع تر مقاصد کے مطابق کر سکے۔ یہی معجزہ ہے، اس سے مراد — جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے — قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ ان قوانین کو، جنہیں خدا کی عادات یا اُس کی سنت کہہ سکتے ہیں ہرگز توڑا نہیں جا سکتا۔ تاہم ایک نہایت محدود مفہوم میں ایک برتر قانون، اپنے سے ادنیٰ قانون کی کارفرمائی میں دخل انداز ضرور ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں کسی خاص مرتبہ وجود کے اندر ایسے افعال رونما ہوتے ہیں جن کی توجیہہ اُسی مرتبے کے لئے مخصوص علل و معلولات کی روشنی میں نہیں کی جا سکتی۔

قرآن حکیم میں 'ایمان بالغیب' کی جو ترکیب استعمال ہوئی ہے اسے معجزات کی بحث سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں ان افراد کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں جو کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ان خصوصیات میں 'ایمان بالغیب' کی حیثیت بنیادی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر یہ اصطلاح ایک بغیر سوچے سمجھے اور اندھے اعتقاد (Blind Faith) پر دلالت کرتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ قرآن کتاب مبین ہے۔ اس سے استفادہ کرنے کے لئے جو طریق کار بھی تجویز کیا جائے اس میں Mystification کا عنصر بہرحال موجود نہیں ہونا چاہیئے۔ ایمان دراصل علم و معرفت

بھی قرار رہتی ہے۔

یکسانی اور تعلیل کے قوانین بلاشبہ پوری کائنات میں جاری و ساری ہیں لیکن یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ قوانین وجود کے مختلف مدارج میں مختلف انداز سے کارفرما ہیں۔ جب ایک فطرتی سائنسدان (Natural Scientists) قوانین اور ان کی حکمرانی کی بات کرتا ہے تو اس کے تصور میں بالعموم صرف مادی قوانین ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مادہ درجاتِ وجود میں سے صرف ایک درجہ ہے۔ اس کے علاوہ حیات اور ذہن کے درجات بھی ہیں۔ یہ تینوں یعنی مادہ، حیات اور ذہن اپنی اپنی تعلیل میں منفرد ہیں۔ زندگی مادے سے اعلیٰ اور ذہن خود زندگی سے برتر ہے جب یہ مختلف طبقات ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں گے تو ہر اعلیٰ علیت ادنیٰ علیت پر اثر انداز ہوگی اور اس میں تغیر پیدا کرے گی۔ اس نقطے کی صراحت علامہ اقبال نے خدا سے مخاطب ہو کر بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ علامہ کے اشعار ہیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہاں اقبال نے خدا کی قدرت اور اس کی کاریگری سے مقابلہ نہیں کرنا چاہا ہے بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انسان کس طرح اپنے ذہن اور ارادے سے مادی کائنات کے فطری رجحانات کو اپنے تابع بنا سکتا ہے۔ وہ شخص جو محض مادی سطح پر سوچنے کا عادی ہے اُسے اس نوعیت کے مظاہر پر یقیناً احساس ہوگا کہ قوانین فطرت کے خلاف بات ہو گئی ہے۔ وہ اس اختلاف کی تصویب (Justification) کے لئے مادی کائنات ہی کی طرف رجوع کرے گا اور مختلف مفروضات وضع کر کے انہیں ثابت کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اُس کی یہ کوشش کبھی مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ وہ اپنی تحقیق میں کائنات کے اعلےٰ مدارج کو نظر انداز کر رہا ہوگا۔

ایک عام آدمی کو ان تین طبقات کے علاوہ کسی شے کا تجربہ اور مشاہدہ

ہی کی ایک صورت ہے ۔ یہ اُس یقین محکم سے عبارت ہے جس کے مطابق مرئی حقائق سے ماورئی موثر مداقتیں موجود ہیں اور محسوس اشیاء ہی کل کائنات نہیں ہیں قرآن نے یقیناً مادی کائنات کی اہمیت اور اس کے بارے میں غور و فکر کرنے پر بہت زور دیا ہے لیکن مختلف مظاہر کو محض آیات الٰہیہ کا درجہ دیا گیا ہے ۔ اس لحاظ سے فطرت کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعتاً موجود ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کے اندر کچھ مابعد الطبعی اور تصوراتی جہتیں پائی جاتی ہیں ۔ وہ لوگ جو ان جہتوں سے نا آشنا ہیں کائنات کو عملی اعتبار سے خود مکتفی سمجھتے ہیں ان کے نزدیک خدا ایک موثر اور فعال ہستی نہیں ہے جو ہماری دُعاؤں کو قبول کرتی ہے ۔ جس سے معجزات کا صدور ہوتا ہے اور جو انسان کے ساتھ ایک شخصی رشتہ استوار کر کے مختلف مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کے ساتھ شریک کار ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس اگر ان جہتوں کو ملحوظ رکھا جاتے تو ہم اس زمان و مکان کی کائنات پر جس قدر زیادہ غور کریں گے معجزات پر ہمارا یقین و ایمان اُسی قدر راسخ ہوتا چلا جائے گا ۔۔۔

( قرآن کانفرنس منعقدہ ۲۹ مارچ ۸۱ء قرآن اکیڈمی میں پڑھا گیا ۔ )

❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀❀

## بقیہ : " علم اور رجائیت "

۔۔۔ اس شخص کو حواس کے دیئے ہوئے علم کو کام میں لاتے ہوئے اور اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے ، غیب پر ایمان لے آتا ہے اور وحی الٰہی کو اعلیٰ ترین اور صحیح ترین منبع علم جانتا ہے ۔۔۔ قبولیت دعا کے کسی لمحے پکار اٹھتی ہے :

" یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی إلٰی
ربّکِ راضیۃ مرضیّہ "

# علم اور رجائیت

از قلم
صلاح الدین ایوبی

ارشادِ ربانی ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب یہ بات اپنی جگہ اہم کہ پروردگارِ حقیقی سے بڑھ کر لائقِ عبادت اور کونسی ہستی ہوسکتی ہے اور ذکرِ الٰہی سے بڑھ کر اور کون سا ذکر ہے۔ لیکن یہ بات اس جملہ کے پہلے جزو سے بھی بزیادہ لائقِ اعتبار اور حاملِ عمومیت ہے کہ اطمینانِ قلب سے بڑھ کر اور کوئی شے چاہے جانے کے قابل نہیں۔ طمانیتِ قلب حاصل کرنے کے لئے ہر بنی آدم اپنے اپنے مبلغِ علم کی بنیاد پر نشان ہائے منزل ترتیب دے لیتا ہے اور اسی نسبت سے ہر ایک کے نزدیک اقدار کا ڈھانچہ بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ یہ اقدار خالص ترین مادیت سے لے کر اعلیٰ ترین روحانیت تک Range کرتی ہیں۔ بایں ہمہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امید اور جستجو بجائے خود انسانی زندگی کی اہم ترین اقدار ہیں ؎

آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست
فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

اب سوال یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے مطلوب کا جو معیار تشکیل دیتا ہے اس کی بنیاد کیا ہوا کرتی ہے؟ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مطلوب و مقصود کا انتخاب مبلغِ علم پر منحصر ہے اور مبلغِ علم کا دارومدار درحقیقت منبعِ علم ہے۔ ہر شخص کا یہ انتخاب کہ وہ کون کون سے ذرائعِ علم کو اپنے لئے اہم اور قابلِ عمل جانتا ہے۔ اس کے نظامِ اقدار پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

فلاسفہ اور مفکرین نے مختلف ادوار میں مختلف منبع ہائے علم کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ اور ان کی متابعت میں چلنے والی اولادِ آدم نے اسی رجحان سے اپنے نظامِ زندگی کو تشکیل دیا چنانچہ Bacon نے نیچر (Nature) کو ذریعہ علم سمجھا اور حواس کی معرفت کو یقینی سمجھا۔ Descartes نے خدا کو حقیقت ثابتہ تسلیم کرتے ہوئے عقل کو علم کا حقیقی منبع قرار

دیا۔ ہیگل اور مارکس نے الوہیت حقائق واقعہ (Deism of Existing Facts) پر ایمان لاتے ہوئے تاریخ کو یہی درجہ عطا کیا۔ ہوتے ہوتے نوبت بہ اینجا رسید کہ Facts of Language کو الوہیت کا درجہ حاصل ہوگیا۔

تاہم ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانی عقل وفہم کا معیار صدیوں کے اُلٹ پھیر کے باوجود نہ بدل سکا اور ہم اسے کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلتا ہوا دیکھتے ہیں نے ایک جگہ لکھا ہے

"The idea of a law which determines the direction and the character of evolution is a typical ninteenth century mistake arising out of the general tendency to ascribe to the natural law the functions traditionally ascribed to God."

اسی طرح مارکس ازم نے جو Historical Prophecies کی ہیں وہ بھی (انسان ہی کے لکھے ہوئے) Old testament کی پیشین گوئیوں سے اپنی عمومی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً منفرد نہیں۔ بیکن اور دیکارت نے جس انقلاب فکر کی ابتدا کی اس کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی کہ "سچائی عالم آشکارا ہے" (The Truth is manifest) اس فکر کے پیش نظر انسان کو تحصیل علم اور تنزیہہ حقائق کے لئے حواس اور عقل سے ماوراکسی منبع علم سے بے نیاز کرنے کا جذبہ تھا اور اس طرح دور جدید کے فلاسفہ نے اس رجائیت پسندی کی بنیاد رکھی جو ماورائے عقل اور مابعد الطبیعات حقائق کے کھوج سے فرار پر مبنی تھی۔ اپنی اس "دریافت" کو ان حکماء نے اس فارمولے میں سمونے کی کوشش کی کہ

"Man can know, Thus he can be free"

اور اس طرح یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ فقط یہی فلسفۂ رجائیت، آزادروی کے رجحانات پیدا کرسکتا ہے۔ ایک بار پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں بند کرکے پیش کی جارہی ہے۔ جب افلاطون یہ کہتا ہے کہ "All Knowledge is re-cognition"

تو وہ بھی اسی بات کا اظہار کر رہا ہے

(جب افلاطون یہ کہتا ہے کہ ـــــ ہماری روح فطرت سے کامل ہم آہنگی رکھتی ہے اور تمام علوم سے واقفیت ! پیدائش کے عمل کے دوران ہم یہ سبھی کچھ فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن بالآخر ہم اپنی یادداشت واپس لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ـــــ تو کیا افلاطون علم آدم الاسماء کلھا اور عہد الست کی تفسیر بیان نہیں کر رہا ؟)

بہر حال ہم بات کر رہے تھے رجائیت پسندی اور اس کے پیدا کردہ آزاد روی کے رجحانات کی۔ دور جدید کے تمام افکار کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ :

ـــــ انسانی علم انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور تمام انسانی کمزوریوں سے پوری طرح مرصع

ـــــ اگر ہم اس کمزوری سے بچنے کے لئے Objective truth کے نظریہ پر ایمان لاتے ہوئے بین الانسانی علم تشکیل دینا چاہیں تو ہمیں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے ـــــ Rational self criticism کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔

ـــــ بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیشکردہ علم کی "حاکمیت" قبول کرنے پر تیار نہیں ہو سکتی۔

ـــــ انسان یا تو اپنے ہی گھڑے ہوئے بت ـــــ کوئی نظریہ ـــــ کی پرستش کرتے ہوئے اپنی آزاد روی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا یا بہتر نظریہ کی کھوج میں ایک لامحدود تگ و دو کا شکار ہو جائے گا۔

ـــــ یہ تمام نظریات کسی ایسی Authority کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں جو Un-challangable ہو

درج بالا تمام حقائق کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کا انسان عقلیت کے فریب میں آکر ایک ایسے دوامی کرب کا شکار ہو گیا ہے جس سے نجات اسے ممکن نظر نہیں آتی۔ وہ جو Existential Faith کی بات کرتے ہیں خود ہی Bad Faith کا شکار ہیں۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی فلسفی اپنے "قال" کو "حال" کا درجہ نہ دے سکا۔ اس کا علم نہ تو اسے عقلی طور پر مطمئن کر سکا نہ قلبی طور پر۔ اگرچہ بعض حکماء جو راہ راست کی جانب دو چار قدم اٹھا سکے گا ہے گا ہے تا نیا نے رسید کرتے رہے:

"Failure to act according to moral law is nothing but failure to be free." (Kant)

تاہم انسان اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے جال میں خود ہی بری طرح گرفتار ہوتا چلا گیا۔ اور اس کی محدود عقل نئے سے نیا اور حقیر سے حقیر بت تراشتی رہ گئی۔

علامہ اقبال نے جب الہیات کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں اپنی Epistemology ترتیب دی تو محولہ بالا فلاسفہ ہی کے پیرایہ میں کائناتی وحدت کو حقیقت ثابتہ کا درجہ دیا اور وجدان کو اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ثابت کیا گیا۔

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد

اقبال کے نزدیک زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے اور اس کی ماہیت میں خواہشات اور مطمح ہائے نظر کی مسلسل تخلیق مضمر ہے۔ نئے نئے معیارات کی تشکیل، ایک مستقل کشاکش کو جنم دیتی ہے۔

سازد از خود پیکر اغیار را
تا فزاید لذت پیکار را

خودی کو دو مُکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے ماحول سے برسرپیکار رہتی ہے اور تسخیر عالم کی جدوجہد میں مصروف۔ دوسری جانب اپنے آپ کو لافانی بنائے رکھنے کے لئے وہ اپنے لئے نت نئے معیار اور مطلوب و مقصود تشکیل دیتی رہتی ہے۔ گویا اپنے لئے لافانی ہونے کا انتخاب کرتے ہوئے وہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور اس لمحہ خودی اپنی آزادی اور اپنی لافانیت کا اثبات کرتے ہوئے پکار اٹھتی ہے:

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

اس طرح اقبال جو نظریہ پیش کرتا ہے، وہ آزادی و خود مختاری اور حاکمیت و الوہیت کے مجازات کا ایک حسین [illegible] ہے۔ جب ہم اس نظریہ کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو تقدیر [illegible] ہے جو مجبوری و مختاری کے تمام فلسفیانہ مسائل کا حل ہے۔

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست !! زانکہ تقدیرات حق لا انتہاست

شبنمی افندگی تقدیر تُست ــــ! قلزمی پائندگی تقدیر تُست

دنیا میں فقط ایک نظریۂ علم ایسا ہے جو حقیقی معنوں میں رجائیت پسند ہے اور آزادروی کے رجحانات کو جنم دینے والا ہے اور وہ ہے نظریۂ علم بالوحی!

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات

مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

احکام الٰہی کی پابندی ــــ وحی کی متابعت ــــ ایک ایسی ذات کی حاکمیت کا اقرار ہے جو سب سے بزرگ وبالا ہے۔ ایک ایسے علم کی رہنمائی قبول کرنا ہے جس میں کسی من کی موج کا کوئی شائبہ نہیں۔ ایک ایسے نظریہ کی قبولیت ہے جس کا کوئی رد نہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی آزادروی کے لئے خود کو تیار کرنا ہے کہ

دل بکسے نباختہ باد و جہاں نہ ساختہ ــــ!

یہ تو ایک ایسی ستیزہ کاری ہے کہ اگر اس میں خونِ جگر شامل ہو جائے اور آتشِ شوق کی آنچ میسّر ہو تو اس کی پہنچ قلب کے منوّر گوشوں سے لے کر آفاق کی عمیق ترین وسعتوں تک ہے۔

علم بالوحی کا جو خاصّہ قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے وہ یقیناً کسی اور منبع علم کو حاصل نہیں یعنی ــــ "علم الانسان مالم یعلم" ــــ وہ تمام امور جو مابعد الطبیعات سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کے بارے میں منطق اور کلام کے تمام اصول و قوانین ناکافی ثابت ہوئے ہیں' ان تمام امور کے بارے میں ٹھیک ٹھیک رہنمائی ہمیں ملتی ہے تو قرآن پاک سے! اس لئے ہماری epistemology کا اصل الاصول یہ قرار پاتا ہے کہ ایمان بالغیب کی حاکمیت (Authority) کو تسلیم کرتے ہوئے علم بالوحی کو حقیقتِ واقعہ کے طور پر قبول کیا جائے۔

جب ہم ایک ایسے نظریۂ علم کو قبول کر لیتے ہیں جس کی حدود ہمارے حواس کی حدود سے وسیع تر ہیں اور ہماری عقل کی تنگنائیوں سے کہیں وسیع ہیں تو ہمیں اس کرب سے دوچار نہیں ہونا پڑتا جو لاادریت کی صورتحال کا خاصہ ہے۔ ہمیں اس کرب سے بھی نجات مل جاتی ہے جو اپنے ہی کسی ہمسر یا اپنی ہی کسی تخلیق کی غلامی کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب ہم کو الوہیت اور حاکمیت کا ایک ایسا معیار مل جاتا ہے جو ہر تنقید سے بالا ہے تو ہماری روح پکار اٹھتی ہے

"اذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا"

اور وہ ذات جو تمام غایتوں کی غایتِ اولیٰ ہے' تمام علوم کا منبع ہے' تمام حکمتوں کا خزینہ ہے

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

# انسان:
# صلاح و فسادِ عالم کا مرکزی کردار

از قلم: مولانا الطاف الرحمٰن نبوی

زیرِ نظر مضمون دراصل مولانا کی ایک زیرِ طبع کتاب 'سیرۃ الخلیل' کے ایک باب کا ایک جزو ہے (یعنی باب اوّل کا تیسرا عنوان) — چونکہ یہ مضمون دین کے فلسفہ و حکمت سے متعلق ہے اس نے اسے شاملِ شمارہ کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

حضرت ابراہیمؑ کی سیرت کے مختلف گوشوں اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر خامہ فرسائی کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس قدرتی سوال کا تسلی بخش جواب فراہم کیا جائے کہ ..... انسانی بدحالی کی انتہا سہی ..... ہر دے سے نبوت ..... یعنی اصلاح الناس کی خدائی تدبیر ..... کی حاجت ہی کیا تھی؟ جس کی تاثیر کے لئے تخلیق و تکوین کے عام قاعدوں کو توڑ پھوڑ کر نئی نئی کرشمہ سازیاں دکھائی جاتی ہیں[1]۔ اور ماننے نہ ماننے والوں کی نہ ختم ہونے والی ستیزہ کاریاں روا رکھی جاتی ہیں۔ ——

یہ مرکزی سوال تین باتوں کی تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا اصل جواب بھی انہی تین باتوں کی مکمل تشریح و توضیح ہی ہے۔

پہلی بات یہ کہ کائنات میں انسان کی حیثیت اور مقام کیا ہے؟ ——

—— دوسری یہ کہ راہِ صواب کی یافتگی کے لئے اس کی اپنی عقل و خرد کافی نہیں تھی اور

---

[1] انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی صداقت ظاہر کرنے کے لئے ان کو معجزات و خوارق سے نوازا جاتا ہے۔ جو تکوین کے عام قاعدوں کے شکست و ریخت ہی سے وجود میں آتے ہیں۔

——— تیسری بات یہ کہ وہ بہت اہم اور اس کی عقل ناکافی سہی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ شرعی رہنمائی کے بغیر تباہ و برباد ہو جاتا، آخر خدائے کبیر و متعال کی عزت و عظمت اور کبریا و جبروت کا کون سا گوشہ اس سے متاثر ہوتا جو اس کی اصلاح اور ہلاکت و ضیاع سے بچاؤ اس قدر ضروری ٹھہرا ——— چنانچہ باب اول کے اختتام تک انہی تین سوالوں کا خاطر خواہ جواب دینے کی کوشش کی جائے گی ———

انسان جو بظاہر کئی فٹ کے احاطے میں سمویا ہوا ایک معمولی سا کالبد خاکی نظر آتا ہے اور اپنی بے شمار مادی ضروریات کے ہاتھوں میں ایک بے بس کھلونا دکھائی دیتا ہے، فی الواقع ایسی عظمت و رفعت کا حامل ہے جو کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو شعوری یا غیر شعوری طور پر بلا جھجک تسلیم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی بقاء حیات میں عرش تا فرش پھیلی ہوئی مخلوقات میں سے ایک ایک چیز کا محتاج ہے کہ یہ سب اس کی نشو و نما میں بلا واسطہ یا بالواسطہ اثر رکھتی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ساری چیزیں اسی کا فیض وجود ہیں کہ خلق و ایجاد کی غایت اصلی اسی کی ابتلاء و آزمائش ہے اور باقی سارا عالم رنگ و بو اس کی تکمیل کا ساز و سامان ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ افضل الموجودات اور اشرف المخلوقات قرار پایا ہے ———

بادی النظر میں اس کی یہ شرافت قدرت کی ایک ایسی حاکمانہ تخصیص معلوم ہوتی ہے جس میں کسی حکیمانہ وجہ استحقاق کا کوئی عمل دخل نہ ہو لیکن ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ فقط فضل و شرف انسانی ہی پر کیا منحصر، کسی بھی تکوینی حادثے یا تشریعی حکم کو خدا تعالیٰ کی مشیت قاہرہ ہی کا نتیجہ سمجھنا حد درجہ ظاہر بینی اور کسلمندی یا اس قلندرانہ اغماض کی رد تو ہو سکتی ہے جو ناپختہ حال صوفیاء کا وطیرہ ہے کسی سلیم العقل خدا شناس مرد مومن کا طریقہ ہرگز نہیں ———

صحیفۂ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے یہ بخوبی روشن ہو چکی ہے کہ خدائے مختار نے دنیا کی کوئی چیز بے کار نہیں بنائی۔ ع

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں ——— کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے توں توں ہر چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ افادیت اور حکمت و مصلحت پر استواری کا یہ قانون کیا تکوین

اور کیا تشریع دونوں میں یکساں طور پر نافذ اور جاری ہے ——

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ (سورۃ انبیاء۔ آیت ۱۶)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس طور پر نہیں بنایا کہ عبث کام کرنے والے ہوں۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (سورہ حجر آیت ۸۵)

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان چیز کو بغیر مصلحت کے پیدا نہیں کیا۔

اس نوع کی دوسری آیات تکوینیات کی ایک ایک جزئی کی حکمت آمیزی کی شہادت دیتی ہیں، اسی طرح سے تشریعی احکام بھی محض قدرت کی عظمت اور جبروت کا اظہار نہیں بلکہ لاتعداد دینی اور دنیاوی منفعتوں کا ذریعہ ہوتے ہیں —— امام ابن تیمیہؒ نے "منہاج السنۃ" میں اسی کو جمہور اہل تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور کلام کا اجماعی مسلک قرار دیا ہے۔ اسی طرح علماء ہند کے سب سے بڑے رازدان اور محرم اسرار شریعت حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنی مشہور زمانہ تالیف "حجۃ اللہ البالغہ" کے آغاز میں ہی تحریر فرماتے ہیں:—

وقد يظن ان الاحكام الشرعية غير متضمنة لشيءٍ من المصالح وانه ليس بين الاعمال وبين ما جعل الله جزاءً لها مناسبة وان مثل التكليف بالشرائع كمثل سيدٍ اراد ان يختبر طاعة عبده فأمره برفع حجر او لمس شجرة مما لا فائدة فيه غير الاختبار فلما اطاع او عصى جوزي بعمله وهذا ظنٌ فاسدٌ تكذبه

کبھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شریعت کے احکام عقلی مصالح پر مشتمل نہیں اور نہ اعمال اور ان کی جزا و سزا میں کوئی مناسبت ملحوظ ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلام کی فرمانبرداری کا امتحان لینا چاہے اور اس کو کسی پتھر کے اٹھانے یا کسی درخت کے چھونے کا یا کسی اور کام کا حکم کرے جس میں اس کی آزمائش کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو۔ اب اگر اس نے اطاعت کی یا نافرمانی کی تو

السُنّة واجماع القرون — اسی کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

المشهود لها بالخير: — یہ گمان کرنا بالکل فاسد ہے جس کی

تکذیب سنّتِ رسول اور قرونِ اولیٰ کے اجماع نے کی ہے جس کی اچھائی کی شہادہ دیجا چکی ہے۔

تاہم یہ ضروری نہیں کہ کسی بھی تکوینی یا تشریعی امر کے جملہ یا بعض اسرار و حکم تک ہر ہر فرد انسانی یا کم سے کم کسی بھی فرد کی رسائی بالضرور ہو۔ تکوینیات کی مصلحتوں کا تو ذکر ہی کیا اس کے ایک بہت بڑے حصّے کے وجود ہی کا تاہنوز علم نہیں ہو سکا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان برملا اعلان کر چکے ہیں کہ جو کچھ علم و تحقیق کی گرفت میں آچکا ہے یہ اس سے بہت کم ہے جو ابھی دریافت نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح سے شرعیات کی تمام تر تفصیلات کے اسرار و غوامض کا علمی احاطہ نہ صرف یہ کہ ابھی تک ناپید ہے بلکہ اس حیاتِ ناسوتی میں ممکن ہی نہیں ——— امام فخر الدین رازیؒ "مناظراتِ امام رازی" میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

لا تفی بمعرفتها عقول البشر بل الحق انهٗ لا یعلمها الا الله سبحانهٗ

انسانوں کی عقلیں ان حکمتوں کی تہہ تک رسائی نہیں کرسکتیں بلکہ حق یہ ہے کہ اللہ کے بغیر ان کو کوئی نہیں جانتا۔

تو جب کہ تکوین و تشریع کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی اپنے اندر ڈھیروں مصالح رکھتی ہیں تو نظامِ تشریع کی وسعتوں کے مرکزی نقطے یعنی انسان کی خلقت و آفرینش کیونکر عبث و بے معنی ہوگی۔

یہی پیدا کرنے والی یہ حقیر سی انسانی مخلوق کائنات کے اندر وہی قدر و منزلت رکھتی ہے جو خود اس کے بدن میں قلب (دل) کو حاصل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب

(مشکوٰة - باب الکسب و طلب الحلال)

بے شک بدن کے اندر گوشت کا ٹکڑا ہے۔ اگر وہ تندرست ہے تو سارا بدن تندرست رہتا ہے اور اگر وہ [illegible] ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ سنو، وہ ٹکڑا دل ہے۔

توجس طرح سے دل نظام جسمانی کا وہ مرکز اور محور ہے جس کی صحت و سقم سے بدن کا کوئی حصّہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بعینہٖ انسان بھی عالم کی اس وسیع اور پیچیدہ مشینری میں وہ اہم ترین کل ہے جس کے احوال کا کائنات کے ذرّے ذرّے پر اثر پڑتا ہے ۔ قرآنی ارشاد،

| | |
|---|---|
| ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا | خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال |
| كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ | کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں ؎ |

(سورہ روم - آیت ۴۱)

میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے ۔ دل کی بابت تو یہ ہر بات ہر کسی کو معلوم ہے کہ وہ جسم کے اندر دورانِ خون کا ضامن اور کفیل ہے ۔ بدن اور اس کے ایک ایک عضو کی زندگی اور حیات خون ہی سے قائم و دائم ہے ۔ دل تندرست ہو تو ہر عضو کو اس کی مطلوبہ مقدار خون کی سپلائی کا کام بحسن و خوبی انجام دیتا ہے، جس کے نتیجے میں ہر عضو بھی جسم کے مجموعی نظام میں اپنی واجبی ذمہ داریوں سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برآ ہوتا ہے اور اس طرح سے بدن کا کاروبار چلتا رہتا ہے ۔ لیکن اگر دل میں کوئی نقص اور فتور رونما ہو جائے تو ظاہر ہے دورانِ خون میں خلل رونما ہوگا، نتیجتہً بدن کے مختلف حصے غذا سے محرومی یا کمی کی بدولت اپنے فرائض کی ادائیگی سے بالکلیہ یا جزوی طور پر دستبردار ہو جائیں گے جس کا اثر زندگی کے خاتمے یا اختلال کی صورت میں نمودار ہوگا ۔ مگر کیا بدن پر اثر اندازی کا یہ عمل فقط دل کے ساتھ مختص ہے ۔ اور اس اہمیت شان کی سزاوار ہے جو حدیث کے انتہائی مؤکدانہ اور مخصصانہ اسلوب سے مترشح ہوتا ہے، ایسا کہنا اور باور کرنا تو نہ صرف ہمارے تجربات کے خلاف بلکہ خود صاحب حدیث کے ان ارشادات کے بھی منافی ہے جو بعض مواقع پر مسلمانوں کے باہمی تعلق کو بدن واحد کے اعضاء کے باہمی تعلق سے تشبیہہ دیتے ہوئے آپؐ نے وقتاً فوقتاً بیان فرمائے ہیں، مثلاً یہ کہ :-

| | |
|---|---|
| المومنون کرجل واحد ان | مسلمانوں کی مثال فرد واحد کی سی ہے ۔ اگر |
| اشتکیٰ عینہٗ اشتکیٰ کلّہٗ و | اس کی آنکھ میں درد ہے تو پورے بدن |
| ان اشتکیٰ رأسہٗ اشتکیٰ کلّہٗ | میں درد ہوتا ہے اور اگر اس کے سر میں |
| (مشکوٰۃ المصابیح) | تکلیف ہے تو بھی پورا بدن تکلیف اٹھاتا ہے ۔ |
| یا تریٰ المومنین فی تراحمھم و | تم مسلمانوں کو باہمی محبت اور ہمدردی میں |

| | |
|---|---|
| تواد هم و تعاطفهم کمثل | جسد واحد کیطرح باؤگے جس کا کوئی بھی |
| الجسد اذا اشتکیٰ عضوٌ تراعیٰ | عضو تکلیف زدہ ہو تو پورا بدن بے خوابی |
| لہٗ سائر الجسد بالسهر والحمّیٰ | اور بخار سے دوچار ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ) |

تو کیا تاثیر و تاثر کے اس عموم کے بعد بھی جو بدن کے تمام اعضاء کو شامل ہے، اس معنی میں دل کے اختصاص اور این چنیں اہتمام کی کوئی گنجائش باقی ہے؛ علاوہ ازیں دل کی یہ کیفیت و حیثیت قدرت کی تخلیق سے متعلق ہے۔ تشریع سے اس کا کوئی تعلق نہیں جبکہ نبوّت کی ہر بات واضح طور پر شرعیات سے تعلق رکھتی ہے، خلقیات سے اس کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہوتی۔ ہاں ضمنی طور پر کوئی خلقی، طبی یا تاریخی حقیقت معلوم ہو جائے تو یہ الگ بات ہے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں کہ "ما ینطق عن الهوٰی ان هو الا وحیٌ یُّوحیٰ" ــــ اور "اوتیت جوامع الکلم" جیسے سندات و اعزازات کے ہوتے ہوئے صاحب شریعت کے اس کلام کو (العیاذ باللہ) کسی لفظی یا معنوی فرو گذاشت پر حمل کیا جائے اور اس کی تصویب سے بے فکری برتی جائے۔

محظورات کی اس بھول بھلیاں سے نکلنے کے لئے اب صرف اور صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث قلب کا وہ ظاہری مفہوم لیا ہی نہ جائے جس سے دل کی کسی بڑی خصوصیت اور کمال انفرادیت کا کوئی تصور نہیں بندھتا، نیز جو منصب نبوّت کے شایاں بھی نہیں اور ایک ایسا مطلب بیان کیا جائے جو ایک طرف تو اس کے لفظی محاسن کا پورا پورا ساتھ دے اور دوسری طرف شریعت ہی کے کسی مہتم بالشان حقیقت پر روشنی بھی پڑے چنانچہ اللہ کا نام لے کر حُسن آغاز و انجام کی دعاؤں کے ساتھ لائق فخر اسلاف کی راہنمائی اور پیروی میں اس مشکل کی عقدہ کشائی کا عمل شروع کئے دیتے ہیں۔ وبا للہ التوفیق ــــــ!!

انسان کا بدن مادی عناصر اربعہ (مٹی، پانی، ہوا، آگ) کی آمیزش سے بن کر تیار ہوا ہے، ان عناصر اربعہ کے حکیمانہ اختلاط و امتزاج سے اس کے مضغہ قلبیہ کے اندر ہی اندر ایک لطیف سا بخار اٹھ آتا ہے جو اس کے چپے چپے میں بھر کر جسم کے تمام اعضاء میں پھیل جاتا ہے۔ یہی بخار حس و حرکت کا خزینہ اور قصد و ارادہ کا گنجینہ ہوتا ہے۔ اور روح حیوانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن جیسے کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اس میں تو انسان کے ساتھ وہ تمام حیوانات بھی شریک ہیں جو حس و حرکت سے بہرہ مند اور قصد و ارادہ سے موصوف ہیں لہٰذا ہیئت و ترکیب کی اتنی سی بات تو انسان کو وہ شرف و

فضیلت ہرگز نہیں بخش سکتی جس کی بدولت وہ تمام ابناءِ جنس سے ممتاز ہے ـــــــ
حیوانوں کے اندر روحِ حیوانی کی نشأۃ سے زندگی کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ اب بدن کے اقدام و امتناع کا ہر عمل اسی کیجانب منسوب کیا جانے لگتا ہے۔ لیکن انسان کے[1] اندر روحِ حیوانی کی پیدائش انسانی زندگی کی بنیاد تو رکھ دیتا ہے مگر خود زندگی فراہم نہیں کرتا۔ یہاں اس کے پیدا ہوتے ہی اس پر ایک اور "روحِ انسانی" کا فیضان ہوجاتا ہے جو اس کے ریشے ریشے میں سرایت کرکے معاً وہیں وہیں پہنچ جاتی ہے، جہاں جہاں روحِ حیوانی پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ روحِ حیوانی کا منبع یہی مضغۂ قلبیہ ہے وہ یہیں پیدا ہوئی ہے اور یہیں پرختم ہوگی لیکن روحِ انسانی کا منشا و مولد یہاں سے بہت دور عالمِ بالا کا کوئی مقام مستور ہے، دل فقط اس کی چند روزہ جلوہ گاہ اور قیام گاہ ہے۔

---

[1] مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں سورہ حجر کی ۲۹ آیت "فاذا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سَاجِدِیْنَ۝ پھر جب ٹھیک کردوں اس کو، اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے، تو گر پڑو اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے" ـــــ کے تحت، روح اور نفس کے متعلق حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یوں ارقام فرماتے ہیں ـــــ

"حضرت قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ روح کی دو قسمیں ہیں، علوی اور سفلی، روحِ علوی مادے سے مجرد اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے جس کی حقیقت کا ادراک مشکل ہے۔ اہلِ کشف کو اس کا مقام عرش کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ وہ عرش سے زیادہ لطیف ہے اور روح علوی بنظرِ کشفی اوپر نیچے پانچ درجات میں محسوس کی جاتی ہے، وہ پانچ یہ ہیں، قلب، روح، سِر، خفی، اخفی، اور یہ سب عالم امر کے لطائف میں سے ہیں، جس کی طرف قرآن کریم نے " قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ " میں اشارہ فرمایا ہے اور روح سفلی وہ بخار لطیف ہے جو بدنِ انسانی کے عناصر اربعہ سے پیدا ہوتا ہے، اور اسی کو نفس کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روحِ سفلی کو، جسے نفس کہا جاتا ہے، ارواحِ علویہ مذکورہ کا آئینہ بنادیا ہے، جس طرح جب آئینہ آفتاب کے مقابل کیا جائے تو آفتاب کے بہت بعید ہونیکے باوجود اس میں آفتاب کا عکس آجاتا ہے اور روشنی کیوجہ سے وہ بھی آفتاب کی طرح چمک اٹھتا ہے اور آفتاب کی حرارت بھی اس میں آجاتی ہے جو کپڑے کو جلا سکتی ہے۔ اسی طرح روح علوی اگرچہ تجرد کی وجہ سے بہت اعلیٰ و ارفع اور بہت مسافت بعیدہ پر ہے مگر اس کا عکس اس روح سفلی کے آئینے میں آکر ارواح علویہ کے کیفیات و آثار

باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے

روحِ انسانی پیدائش کے بعد انسان کے زمانہ قبل از بلوغ تک روحِ حیوانی سے اصل استعداد و صلاحیت کے علاوہ فعلی طور پر کچھ زیادہ متمائز نہیں ہوتی لیکن بلوغ کے بعد اس میں ادراک و تمیز کا وہ نیا چراغ روشن اور علم و ارادے کی وہ نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے اس کے اقتدار و اختیار میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں اب روحِ حیوانی ایک مرکب (سواری) اور روحِ انسانی ایک راکب (سوار) کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جو لگام کے فقط ایک اشارے سے اپنی سواری کو جہاں اور جیسے لے جانا چاہے، بلا حیل و حجت لے جا سکتی ہے، یہی نئی صورتِ حال انسانیت کی وہ خصوصیت اور تمغۂ امتیاز ہے جس کو مخلوق کی کوئی قسم چیلنج نہیں کر سکتا۔

جیسے کہ یہ بات معلوم ہو گئی کہ مضغۂ قلبیہ روحِ انسانی کا اوّلین مہبط و منزل ہے۔ چنانچہ بعلاقۂ محال و محل اس پر قلب (دل) کا اطلاق نہ صرف جائز بلکہ بہت کثرت سے ہوتا رہتا ہے۔ حدیثِ قلب میں قلب سے مراد یہی روحِ انسانی ہے جو سوار کی حیثیت سے سواریٔ بدن کے ہر صحیح اور غلط چال کا ذمہ قرار پاتی ہے اور واقعۃً اپنی صلاح و اطاعت سے بدن کے تمام اعضاء کو صالح و مطیع اور اپنے عصیان و طغیان سے اسکو خدا تعالیٰ کا عاصی اور طاغی بنا دیتا ہے۔ حدیث کا یہ مفہوم واضح ہو جانے کے بعد اب اسکے لفظ و معنی کی مطابقت پر کھئے تو

---

## بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ

اس میں منتقل کر دیتا ہے اور یہی آثار جو نفوس میں پیدا ہو جاتے ہیں، ہر ہر فرد کے لئے ارواحِ جزئیہ کہلاتے ہیں۔۔۔

پھر یہ روحِ سفلی ان کیفیات و آثار کے ساتھ جن کو ارواحِ علویہ سے حاصل کیا جاتا ہے، اس کا تعلق بدنِ انسانی میں سب سے پہلے مضغۂ قلبیہ سے ہوتا ہے اور اسی تعلق ہی کا نام حیات اور زندگی ہے۔ یہ روحِ سفلی پورے بدن میں پھیلی ہوئی باریک رگوں میں سرایت کرتی ہے جن کو شرائین کہا جاتا ہے اور اس طرح وہ تمام بدنِ انسانی کے ہر حصے میں پہنچ جاتی ہے۔ روحِ سفلی کے بدنِ انسانی میں سرایت ہی کو نفخِ روح سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ کس چیز میں پھونک بھرنے سے زیادہ مشابہ ہے اور آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے روح کو اپنی طرف منسوب کر کے "من روحی" اس لئے فرمایا ہے کہ تمام مخلوقات میں روحِ انسانی کا اشرف و اعلیٰ ہونا واضح ہو جائے کیونکہ وہ بغیر مادہ کے محض امرِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ نیز اس میں تجلیاتِ رحمانیہ کے قبول کرنے کی ایسی استعداد ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے جاندار کی روح میں نہیں ہے ——

خدشات و شبہات کے وہ سارے بادل خود بخود چھٹ جائیں گے جن کے گھیر اندھیروں میں دم گھٹا جا رہا تھا ـــــــ

تاثیر کے سلسلہ میں قلب کا جو اختصاص اس بحث سے معلوم ہوا ،

| | |
|---|---|
| کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون ٥ | کوئی نہیں پر زنگ پکڑ گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے ہیں۔ |
| (سورہ مطففین - آیت ۱۴) | |

| | |
|---|---|
| اور ، ان المومن اذا اذنب کانت نکتۃً سوداء فی قلبہ فان تاب ونزع و استغفر صقل قلبہٗ منھا وان زاد زادت حتیٰ تعلو قلبہٗ | مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے توبہ کر لی اور اس پر نادم ہو کر اپنے عمل کو درست کر لیا تو یہ سیاہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر وہ گناہوں میں زیادتی کرتا چلا |
| (احمد، ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ) | |

تو سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے تا آنکہ سارے قلب کو گھیر لیتی ہے۔

جیسی آیات و احادیث بظاہر اس کی مخالف نظر آتی ہیں کیونکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جس طرح سے دل کا اثر اعضاء پر پڑتا ہے اسی طرح اعضاء کے اعمال کا اثر دل پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن غور کرنے پر یہ ثابت ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ دل کی کیفیت اعضاء کی کیفیت میں مؤثر ہے اور اعضاء کی عملی کیفیت دل کی نظری کیفیت میں حقیقی مؤثر نہیں ہاں اس کی ترجمان ضرور ہے۔ اور یہی کچھ مراد ہے اس حدیث شریف سے کہ

| | |
|---|---|
| النفس تتمنّٰی وتشتھی والفرج یصدق ذلک ویکذبہ | کسی کام کی خواہش تو دل میں پیدا ہوتی ہے لیکن شرمگاہ (اعضاء) تعمیل یا عدم تعمیل سے اس کی تکذیب یا تصدیق کر دیتی |
| (مشکوٰۃ) | |

ہے۔

امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب "دعوت دین اور اس کا طریق کار" میں تبلیغ کے سلسلے میں دوسری عملی غلطی کی وضاحت کرتے ہوئے اس صورت حال کی مختصر سی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے ـــــــ

" اس کی مثال بالکل قلب اور اعضاء و جوارح کی ہے۔ اگر قلب کی اصلاح

ہو جائے تو سارا جسم خود بخود تندرست ہو جاتا ہے اور اگر دل میں بیماری
موجود رہے تو اعضاء و جوارح پر روغن مالش اور ضماد سے کوئی فائدہ
نہیں ہوتا"۔

کسی عمل پر جزا و سزا کا ترتب خود اس عمل کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کا ارتکاب خیر یا شر کے رسوخ فی القلب کی غمازی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نسیان یا غلطی سے کوئی فعل سرزد ہو جائے تو "رفع عن امتی الخطاء والنسیان" کے تحت اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس اگر دل میں کسی کام کے کرنے کا عزم پیدا ہو جائے تو "اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ" کے بموجب اس پر عمل کی نوبت آئے بغیر بھی ثواب و گناہ کا اطلاق اور اسی کے مطابق جزا و سزا کا ترتب ہوا کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شریعت کی نگاہ میں اصل عمل دل کا ہے، اعضاء اس کا مظہر ہی ہوتے ہیں، ہاں کسی عمل کے اس حد تک اثر اندازی سے انکار بھی ممکن نہیں کہ جب تک اس کا عملی صدور نہ ہو پایا تھا، دل کا ارادہ بدلنے کی گنجائش تھی لیکن صادر ہوتے ہی یہ گنجائش ختم ہو گئی، بہت ممکن ہے کہ مذکورہ قرآنی و حدیثی نصوص میں اسی تبدیلیٔ حالات کو تاثیر کے قالب میں پیش کیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں اقترانِ عمل سے لذتِ گناہ کی تکمیل ہو جایا کرتی ہے اور یہی لذت ہی تو درجات کے تفاوت سے دل کا وہ عمل ہے جس پر اس کا محاسبہ کیا جاتا ہے، چنانچہ اس وساطت سے بھی اگر عمل جوارح کو دل کی زنگاری کا باعث قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

یہ ساری باتیں اس بنیاد پر تو صحیح ہو سکتی ہیں کہ اعضاء کے لئے تاثیر کا اثبات اور ان پر مؤثر کا اطلاق محض مجاز قرار دیا جائے، اس صورت میں مذکورہ توجیہات میں سے کوئی توجیہہ صحتِ مجاز کا کوئی علاقہ بن جائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاثیر اعمال کو محض مجاز قرار دینا اگر پورا مجاز نہیں تو مجاز سے خالی بھی نہیں، ہمارا اپنا اور اپنے بے شمار ساتھیوں کے بارے میں یہی تجربہ ہے کہ اچھی خاصی ذہنی کیفیت بار بار کی بدعملیوں سے ایسی بدل جاتی ہے کہ تبدیلی کے بعد کبھی تو پہلی حالت کا تصور بھی اجنبی سا لگتا ہے۔ اعمال کو بالکل بے اثر کہنا علوم اسلامیہ کے ایک بہت بڑے حصے "فقہ" کی افادیت کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے جس کے نتیجے میں اباحیت اور پھر کھلے الحاد کے وہ تمام

دروازے کھل جائیں گے جن پر فقہ کے مضبوط بند قفلوں کے آہنی تالے پڑے ہوئے ہیں، لہٰذا اعمال میں چار و ناچار ایک گونہ تاثیر ماننی پڑے گی، ہاں اس کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا تعین بلاشبہ معرکۃ الآرا مہمات میں سے ہے ——

ہمارے خیال میں اعمال کے تکرار و اعادہ سے دل کی کیفیت بعینہٖ اسی طرح بدلتی اور متاثر ہوتی ہے جیسے کسی منہ زور اور سرکش گھوڑے کو سواری کا خوگر بنانے کے لئے اس کو اس کے خلافِ طبع صورت حال سے آہستہ آہستہ مانوس و متعارف کرایا جاتا ہے۔ چنانچہ اولاً اس کی پیٹھ پر فقط ہاتھ رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس پر کھڑے کھڑے یا لگام کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے ہوئے چند قدم لیتے لیتے سوار ہونا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ بتدریج ہضم و برداشت کرنے کے بعد اس کو پوری طرح سواری کے کام میں لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشق و تمرین اس کی تسخیر میں بس اتنی سی دخل رکھتا ہے جیسے کسی بہت بڑے بوجھ کو اٹھانے کی اگر سکت نہیں ہوتی تو اس کو بالاقساط اٹھانے کا اہتمام کیا جائے۔ ظاہر کا باطن اور اعضاء کا دل پر جو کچھ بھی اثر ہے، اتنا اور ایسا ہی ہے نہ اس سے زیادہ نہ کم۔ اور یہی مصداق ہے امام غزالیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردی اور ابن تیمیہ کی مندرجہ ذیل عبارات کا جو علی الترتیب احیاء العلوم، عوارف المعارف اور اقتضاء الصراط المستقیم میں اسی سلسلے میں ان کے قلم سے نکلی ہیں۔

وھکذا جمیع صفات القلب تصدر منھا اعمال الجوارح ثم یعود اثر الاعمال علیھا فیولدھا ویزیدھا

(احیاء العلوم)

تمام قلبی صفات کا یہی حال ہے کہ انہی سے اعضاء کے اعمال پیدا ہوتے ہیں پھر اعمال کا اثر پلٹ کر دوبارہ انہی صفات قلبیہ پر پڑتا ہے جس کی بدولت صفات میں رسوخ اور زیادتی پیدا ہوتی ہے۔

نفھمھم یدعو الی العمل وعملھم یجلب صفاء الفھم والعلم والعمل یتناوبان فیہ

(عوارف المعارف)

ان کی سمجھ عمل کو دعوت دیتی ہے اور عمل فہم میں مزید جلاء پیدا کرتا ہے اور اس طرح سے علم و عمل کا تناوب اور ایک دوسرے میں اثر کرتے ہوئے باری

باری آنا جانا جاری رہتا ہے ـــــ

| | |
|---|---|
| وهذه الامور الباطنة و | ان باطنی اور ظاہری امور میں ناگزیر طور |
| الظاهرة بينهما...... ولابدّ | پر ایک ارتباط اور مناسبت ہے، یہی |
| ...... ارتباطٌ و مناسبةٌ | وجہ ہے کہ دل کا شعور اور کوئی بھی کیفیت |
| فان ما يقوم بالقلب من الشعور | اپنے مناسب حال اعمال کو وجود میں |
| والحال يوجب اموراً ظاهرةً وما | لاتی ہے اور ظاہری اعمال دل میں وہی |
| يقوم بالظاهر من سائر الاعمال | شعور اور حالت پیدا کرتے ہیں جو |
| يوجب للقلب شعوراً واحوالاً : | ان سے جوڑ رکھتے ہوں ۔ |

(اقتضاء الصراط المستقیم) ـــــ

حدیث قلب سے متعلق یہ سوال وجواب اور ضروری تفصیلات ممکن ہے کہ بعض قارئین کو غیر ضروری محسوس ہوتی، لیکن جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا اس بحث کے اوائل میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کائنات میں انسان کا وہی مقام ہے جو خود اس کے بدن میں دل کا ہے۔ لہٰذا اس تشبیہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے مشبّہ کی پوری پوری وضاحت بے حد ضروری قرار پائی ہے۔ تاکہ دونوں کی تطبیق میں کوئی خفاء واشتباہ باقی نہ رہے ـــــ

( جاری ہے )

# برّصغیر میں
# علمِ حدیث، تابعین کے عہد میں

از قلم: مولانا محمد اسحٰق بھٹی

سرزمینِ برصغیر جسے اب پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش سے تعبیر کیا جاتا ہے، اخذ و قبول کی بے پناہ صلاحیتوں کی حامل ہے۔ یہ معمورۂ ارض اگرچہ مرکزِ اسلام مکّے اور مدینے سے ہزاروں میل دور تھا۔ تاہم تاریخ و رجال کی کتابوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے اسلام کے ابتدائی دور ہی میں اس کی تعلیمات اور پاکیزہ اقدار کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس گوشۂ ارض کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پچیس ۲۵ صحابہ کرامؓ تشریف لائے سینتیس ۳۷ تابعینؒ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ پندرہ ۱۵ تبع تابعین نے اپنے وجودِ مسعود سے اس کو رونق بخشی اور بے شمار محدثین و فقہا کے قدوم میمنت لزوم سے ارضِ ہند سعادت اندوز ہوئی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جو پچیس صحابہ کرامؓ یہاں تشریف لائے۔ ان میں بارہ حضرت عمرؓ فاروق کے عہد میں، پانچ حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں، تین حضرت علیؓ کے دورِ امارت میں، چار حضرت معاویہؓ کے ایامِ حکومت میں اور ایک یزید بن معاویہ کے زمانے میں آئے۔

یہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، سرزمینِ برصغیر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ کے اوّلین مبلغ اور آپؐ کے ارشادات گرامی کے پہلے داعی تھے، جو اپنی ذات میں آنحضرتؐ کے اسوہ و عمل کے آفتابِ جہاں تاب کی کرنوں کے آئینہ دار تھے — اس کی بعض تفصیلات تذکرہ و رجال کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور ایک مستقل مقالے کی متقاضی — !

صحابہؓ کے علاوہ اقلیم ہند میں مختلف اوقات میں سینتیس ۳۷ تابعین آئے، ان کا شب و روز کا مشغلہ حدیث رسولؐ کی ترویج و اشاعت تھا۔ یہ لوگوں کو دین فطرت کے تہذیبی و ثقافتی دائرے میں شامل کرنے کے لئے کوشاں رہے اور اہل ہند کو ان پاکیزہ اخلاق و کردار اور تعلیم و شائستگی کی ان ارفع و اعلیٰ اقدار سے بہرہ مند کرنے کی سعی کرتے رہے جن کو اسلام میں بنیاد اور اساس کی حیثیت حاصل ہے اور اپنے اس عظیم مقصد کے حصول میں کامیاب رہے۔ یہاں ان سینتیس ۳۷ تابعین کرام میں سے جو وارد ہند ہوئے، چند تابعین کا تذکرہ اور ان کی خدمات کا مختصر سا تعارف مقصود ہے۔

تابعی اسے کہا جاتا ہے، جس نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی صحبت و تلمذ کا شرف حاصل کیا اور ان سے آپؐ کی احادیث مبارکہ کا درس لیا۔

۱ - اس بلند بخت جماعت میں ایک بزرگ ابن اُسید ثقفی تھے، جو اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں علاقہ سندھ کے والی مقرر ہوئے ان کے دادا کا نام انس تھا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور آپؐ نے ایک مرتبہ مؤلفۃ القلوب کے ساتھ انہیں کچھ مال بھی عطا فرمایا تھا۔ ان کے والد گرامی قدر حضرت اسید بھی آنحضرتؐ کے صحابی تھے۔ اسیدؓ کے ایک بھائی مغیرہ بن انس تھے، جو خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے زمانے میں شہید ہوئے۔ علاقہ سندھ میں انہوں نے اشاعت حدیث کی خدمت انجام دی۔

۲ - ابو شیبہ جوہری! ان کا نام یوسف تھا، کنیت ابو شیبہ تھی اور والد ابراہیم تھے۔ قبیلہ بنو تمیم سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے ابو شیبہ یوسف بن ابراہیم تمیمی کہلائے۔ انہوں نے آنحضرتؐ کے مشہور صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سماع حدیث کی تھی اور ان کے شاگرد تھے۔ خود ابو شیبہ نے بھی حدیث کا درس دیا اور عقبہ بن خالد اور مسلم بن عقبہ ایسے عظیم مورخین اور تبع تابعین نے ان سے روایت حدیث کی۔ ابو شیبہ مرد مجاہد بھی تھے۔

محمد بن قاسم کے ساتھ ایک فوجی کی حیثیت سے وارد سندھ ہوئے اور جہاد سندھ میں حصہ لیا - ساتھ ساتھ ارشادات پیغمبرؐ کی بھی ترویج کرتے رہے

۳ - ابو سلیمان ایوب بن یزید بن قیس بن زرارہ : یہ جلیل القدر تابعی، نامور خطیب اور ممتاز ادیب تھے - ابن خلکان کی روایت کے مطابق ان کا شمار چند عظیم المرتبت خطبائے عرب میں ہوتا تھا - فصاحت و بلاغت میں بہت مشہور تھے - روایت حدیث میں بھی بڑی شہرت کے مالک تھے - انہوں نے ہندوستان کے بعض اطراف اور مکران کی سیاحت کی ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ حجاج بن یوسف نے ان سے بعض علاقوں کے حالات معلوم کرنا چاہے تو فرمایا جس ملک کے بارے میں آپ سوال کریں گے، صحیح صحیح جواب دوں گا - حجاج نے کہا - ہند کے متعلق کچھ بتایئے کہا -

بحرھا در، وجبلها یاقوت ، وشجرھا عود ، و ورقها عطر وا هلها طغام کقطع الحمام -

اس کے دریا موتی اگلنے والے، پہاڑ لعل و یاقوت کی کانیں، درخت عود و صندل کی مانند، پتوں میں خوشبو اور مہک، اس کے باشندے کم عقل فاختاؤں کی طرح ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے -

پھر مکران کے بارے میں سوال کیا تو جواب دیا -

ماء ھا وشل، وتمرھا دقل، وسهلها جبل، ولصها بطل ان کثر الجیش بها جاعوا، وان قلوا ضاعوا -

اس میں پانی کم، کھجوریں ردی، میدان پہاڑوں کی طرح، چور بے باک فوج زیادہ ہو تو بھوک کا خطرہ، کم ہو تو ضائع ہو جانے کا اندیشہ -

اس فصیح و بلیغ تابعی اور ممتاز محدث و ادیب کو حجاج بن یوسف نے ۸۴ھ میں قتل کرا دیا تھا -

۴ - حارث بن مرۃ عبدی : تابعی تھے اور قبیلہ عبدالقیس سے تعلق رکھتے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد، فاضل اعظم و ساتھی اور [illegible]
[illegible] تھے - [illegible]

کے بہت بڑے حامی اور فوج کے میسرہ پر متعین تھے - اس جنگ میں انہیں کئی قسم کی تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا - ۳۸ھ میں حضرت علیؓ کے حکم سے حدودِ ہند میں داخل ہوئے - فیاضی اور بہادری کا یہ حال تھا کہ ایک روز ہزار غلاموں کو آزاد کرانے کی قسم کھائی اور پانچ سو شاہ سواروں پر حملہ کیا -

ایک روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ۴۲ھ کو حارث بن مرہ اور ان کے چند ساتھیوں نے قلات میں جام شہادت نوش کیا - کبارِ صحابہ سے ملے - ایک روایت یہ ہے کہ مدرک صحابہؓ میں سے تھے -

۵ ـــــ تابعین کی عظیم القدر جماعت میں بعض حضرات وہ بھی تھے جو سفرِ ہند کے لئے ہر وقت تیار رہتے اور اس ملک میں آنے کا دل میں بہت شوق رکھتے تھے - اس سلسلے کا ایک واقعہ "میزان الاعتدال" میں حافظ ذہبی نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حباب بن فضالہ ذہلی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص اور ممتاز صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور نامور تابعی تھے - وہ بصرے آئے اور حضرت انسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے - ان سے عرض کیا کہ میں سفر پر جانا چاہتا ہوں اور اس کیلئے آپ سے اجازت کا طالب ہوں - فرمایا کہاں جانا چاہتے ہو؟ کہا ہندوستان -! فرمایا تمہارے ماں باپ یا دونوں میں سے کوئی زندہ ہیں؟ عرض کیا زندہ ہیں - فرمایا وہ تمہارے ہندوستان جانے پر خوش ہیں؟ جواب دیا خفا ہیں - میرے والد نے مجھ پر زیادتی کی، وہ امیر کے پاس گئے اور امیر نے مجھے جانے سے روک دیا - حضرت انسؓ نے فرمایا، دنیا چاہتے ہو یا آخرت؟ عرض کیا [illegible] فرمایا [illegible] دونوں ضائع کر بیٹھو گے - [illegible] اور ان کی خدمت میں رہو - [illegible] سکتے -

[illegible] اسلامی لشکر میں حباب بن [illegible] کر فوجی [illegible]

انس نے ہندوستان کے بجائے واپس گھر جاکر والدین کی خدمت کرنے کا مشورہ دیا۔

٦ ــــ ایک تابعی حارث بیلمانی تھے جنہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایتِ حدیث کی اور ان سے ان کے بیٹے محمد بن حارث بیلمانی نے سماعِ حدیث کیا۔

بیلمان، جہاں کے یہ رہنے والے تھے، درحقیقت بھیلمان ہے، عرب مورخوں نے اس کی تعریب کرکے بیلمان بنا دیا ہے ــ یہ ایک قصبہ تھا جو سندھ اور گجرات کاٹھیاواڑ کے درمیان واقع تھا۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حارث کس زمانے میں بھیلمان آئے ۔البتہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھیلمان میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی اس لئے بیلمانی کی نسبت سے مشہور ہوئے ۔انہوں نے بیلمان اور اس کے نواح میں درس و تدریس کے ذریعے حدیثِ رسول کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔

٧ ــــ بیلمان ہی کے ایک اور تابعی عبدالرحمٰن بن ابو زید بیلمانی تھے جو دورِ فاروقی کی ایک جنگ میں غلام کی حیثیت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئے تھے ــ یہ اصلاً یمن کے باشندے تھے اور نجران میں ان کی آمد و رفت تھی ۔انہوں نے کبار صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس عبداللہ بن عمر، حضرت عثمان غنی، عبداللہ بن عمرو، حضرت معاویہ، سعید بن زید، عمرو بن اوس اور عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث روایت کرنے اور ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنے کا شرف حاصل کیا [illegible] تابعین میں سے نافع بن جبیر اور عبدالرحمٰن [illegible] سے سماع [illegible]

[illegible]

کہ صحاح کی دوسری کتابوں میں جن سے روایات درج ہیں - مثلاً جامع ترمذی میں ضوات و داغ کے بارے میں ان سے روایت مروی ہے - نسائی میں عمرو بن علبسہ سے ان کے قبول اسلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے - ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے اور دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ضعیف لا تقوم بہ حجۃ -

انہوں نے بھی تدریس کی صورت میں حدیث کی خدمت انجام دی -

۸ — راشد بن عمرو بن قیس ازدی : مشہور تابعی تھے - حضرت عمر فاروق رضی نے اپنے دور خلافت میں راشد کے باپ عمرو بن قیس کو عراق میں ایک مکان عطا کیا تھا -

راشد بن عمرو بڑے جنگجو اور بہادر بھی تھے - انہوں نے حضرت عثمان رضی کے عہد خلافت (۳۰ھ) میں ہرموز فتح کیا - پھر عہد عثمان ہی میں قلات کی ایک جنگ میں شامل ہوئے اور فتح پائی حضرت معاویہؓ کے زمانۂ حکومت (۴۲ھ) میں بلاد ہند اور سندھ کی بعض لڑائیوں میں شرکت کی - علاقۂ سندھ کے ایک جہاد میں درجۂ شہادت سے سرفراز ہوئے - سندھ کے لوگوں کو دائرہ اسلام میں شامل کرنے کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی اور غیر مسلموں میں آنحضرتؐ کا پیغام پہنچایا -

۹ — زائدہ بن عمیر طائی کوفی : - ابن سعد نے ان کو کوفے کے طبقۂ ثالثہ کے تابعین میں شمار کیا ہے - انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی، عبداللہ بن عمرؓ، جابرؓ بن عبداللہ، حضرت ابوہریرہؓ اور نعمانؓ بن بشیر سے جو اکابر صحابہ تھے، روایت حدیث کی -

زائدہ بن عمیر طائی وہ جلیل القدر تابعی تھے - جو فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسمؒ کے ہم رکاب ہو کر یہاں آئے تھے - جب محمد بن قاسم کی فوج نے ملتان کی طرف پیش قدمی کی تو زائدہ بن عمیر اس وقت اسلامی لشکر میں موجود تھے - سندھ کے نومسلموں میں احکام اسلام کی اشاعت ان کے ذمے تھی -

۱۰ — ایک اور نامور تابعی کا نام زیاد بن حواری عبدی تھا - ایک روایت

کے مطابق زید بن حواری عبدی اور ایک روایت کی رو سے حواری بن زیاد تھا - یہ جہادِ سندھ میں شریک اور محمد بن قاسم کا دست و بازو تھے - محمد بن قاسم نے جن لوگوں کو راجہ داہر کا سر دے کر عراق بھیجا تھا، یہ ان میں شامل تھے - یہ وہ جلیل القدر تابعی ہیں، جنہوں نے متعدد صحابہ مثلاً حضرت انس رضی بن مالک اور عبداللہ بن عمرو رضی وغیرہ سے روایت کی - خود زیاد بن حواری عبدی نے بھی سلسلۂ درس جاری کیا اور ان سے بڑے بڑے محدثین میں سے اعمش، عبدالملک بن عمیر، سبیعی، محمد بن فضل بن عطیہ، سلام الطویل، ایوب بن موسیٰ اور بہت سے حضرات نے علم حدیث پڑھا۔ ابن حبان نے زیاد بن حواری کا ذکر ثقہ راویوں میں کیا ہے - یہ بھی بلادِ سندھ کے مبلغین حدیث میں سے تھے -

۱۱ - ابو قیس زیاد بن رباح قیسی بصری :- یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اور بعض دیگر صحابہ کے شاگرد تھے - حضرت ابو ہریرہ رضی سے، اس حدیث کے یہی راوی ہیں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ :-

من خرج من الطاعة و فارق الجماعة فمات میتة جاھلیة -

یعنی جو شخص طاعت کے دائرے سے باہر نکلا اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا، وہ جاہلیت کی موت مرا -

ابو قیس زیاد بن رباح کو ابن رباح بھی کہا جاتا ہے اور ابو رباح بھی! ان سے حضرت حسن بصری اور دوسرے حضرات نے روایت کی ہے - ابن حبان ان کا شمار ثقہ رواتِ حدیث میں کرتے ہیں - عجلی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں - ان کی روایت سے صحیح مسلم میں بھی حدیث درج ہے -

ابو قیس وہ تابعی ہیں جو محمد بن قاسم کی معیت میں بغرضِ جہاد سندھ آئے - چچ نامہ میں مرقوم ہے کہ محمد بن قاسم نے اپنے رفقائے جنگ میں سے دو سو افراد پر مشتمل جس جماعت کے ہاتھ داہر کا سر اور مالِ غنیمت کا حصہ عراق

بھیجا تھا، ابوقیس اس جماعت کے امیر تھے - زیاد بن حواری عبدی بھی، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس جماعت میں شامل تھے - انہوں نے عراق جا کر ملوکِ ہند کے واقعات بیان کئے اور بعض ضروری باتوں کی اطلاع دی -

ابوقیس نے محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ کے جہاد میں جو خدمات انجام دیں اور جس جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر ان کتابوں میں مرقوم ہے جو خطۂ سندھ کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن ان میں ان کا نام ابوقیس کے بجائے قیس لکھا ہے -

اس دَور کے واقعات میں سے یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ جب محمد بن قاسم نے راجہ داہر پر حملے کی تیاری کی تو داہر نے مسلمانوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے چند جاسوس بھیجے اور انہیں حکم دیا کہ اسلامی لشکر میں گھوم پھر کر حالات کا گہری نظر سے جائزہ لیں اور پھر جس نتیجے پر پہنچیں اس کی تفصیل سے آگاہ کریں - چنانچہ جب جاسوس اسلامی لشکر میں آئے تو مسلمان فوجی نماز ادا کر رہے تھے اور محمد بن قاسم ان کے امام تھے - انہوں نے دیکھا کہ مسلمان اللہ کے حضور کھڑے ہیں اور کامل خشوع و خضوع سے اپنے پروردگار کی عبادت میں مصروف ہیں، اسی طرح کرتے ہیں، جس طرح ان کا امیر کرتا ہے اس سے وہ نہایت متاثر ہوئے - واپس جا کر راجہ داہر سے کہا کہ یہ لوگ نظم و نسق کے انتہائی پابند اور اپنے امیر کے کمال درجے کے اطاعت گزار ہیں - جنگ کے خطرناک موقعے پر بھی یہ اپنے اللہ کی عبادت کو مقدم قرار دیتے ہیں - جس دلچسپی اور انہماک سے یہ اپنے پیغمبر کے بتائے ہوئے احکام پر عمل پیرا ہیں، [illegible] کی کہیں مثال نہیں ملتی - ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ انہیں شکست نہیں دے سکیں گے -

پھر واقعات نے [illegible] کیا کہ [illegible] بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور اللہ و رسول کے حلقۂ اطاعت میں شامل ہو گئے -

اس کا سبب یہ تھا کہ اس پاکباز گروہ کا ہر فرد اپنے عمل و کردار سے حدیث کا مبلغ تھا اور ان کی زندگی کے ہر گوشے میں اتباعِ پیغمبر کا داعیہ

موجزن تھا - میدانِ جہاد میں ہوں یا مسندِ درس پر، ہر مقام اور ہر حال میں آنحضرت ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ان کے پیشِ نگاہ رہتا -

۱۲ــ سعد بن ہشام انصاری :- یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی اور تابعی تھے - انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی روایتِ حدیث کی اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی سماعِ حدیث کا شرف حاصل کیا - علاوہ ازیں ہشام بن عامر انصاری رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور سمرہ رضی اللہ عنہ بن جندب ایسے جلیل القدر صحابہ کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیا - بعد ازاں خود سرگرم درسِ حدیث ہوئے - جن حضرات نے ان کے حلقۂ درسِ حدیث میں شمولیت کی، ان میں حسن بصری، حمید بن ہلال، زرارہ بن ابی اوفیٰ اور حمید بن عبدالرحمٰن کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں -

حسن بصری فرماتے ہیں کہ سعد بن ہشام نے سرزمینِ مکران میں شہادت پائی - ان کے الفاظ ہیں قتل فی الارض مکران علیٰ احسن حاله
یعنی سعد بن ہشام اپنی تمام اچھائیوں کے ساتھ مکران میں شہید کیے گئے -
غور کیجیے [illegible] امام حسن بصری [illegible] القدر تابعی [illegible]
[illegible] - [illegible]
[illegible]
جمع کر دیے گئے ہیں -

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ابن حبان نے لکھا ہے کہ انھوں نے [illegible] میں [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] گئے تھے -

ایک روایت یہ بھی ہے کہ سعد بن ہشام نے سرزمین ہند میں حضرت عمرؓ بن خطاب کے عہد خلافت میں مرتبۂ شہادت پایا۔

۱۳ — سعید بن اسلم کلابی :- یہ بنی ربیعہ بن کلاب سے تعلق رکھتے تھے اور تابعی تھے۔ امام بخاری نے تاریخ الکبیر میں لکھا ہے کہ سعید بن اسلم نے اپنے موالی سے جو بنی غفار سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، روایت حدیث کی۔ خود سعید بن اسلم نے بھی درس حدیث کی مسند بچھائی اور ان سے بکیر بن اشجع وغیرہ نے سماعِ روایت کی۔
ابن حبان نے ان کو تابعین میں شمار کیا ہے۔

ابن ماکولا کا کہنا ہے کہ سعید بن اسلم سندھ کے والی تھے اور ان کے والد اسلم بن زرعہ کے سپرد خراسان کی ولایت تھی۔

یہ بھی منقول ہے کہ سعید بن اسلم مکران کے والی بھی رہے اور وہیں شہید ہوئے۔ جب تک یہ سندھ میں رہے ترویجِ علمِ حدیث کو اپنا مطمعِ نظر ٹھہرائے رکھا۔

۱۴ — موسیٰ سیلانی :- یہ تابعی تھے اور سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ مقدمہ ابن الصلاح کے بیان معرفۃ الصحابہ میں حضرت انس سے موسیٰ سیلانی کی ایک ملاقات کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

لقیت انس بن مالک فقلت هل بقی من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد غیرك ؟ فقال بقی ناس من الاعراب نقد رأوہ، اما من صحبه فلا۔

یعنی ابوموسیٰ سیلانی کہتے ہیں، میں حضرت انس بن مالک سے ملا، اور ان سے پوچھا، کیا آپ کے سوا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی اور صحابی باقی ہے ؟ فرمایا چند ایسے اعراب باقی ہیں، جنہوں نے آنحضرتؐ کو دیکھا تو ہے مگر ان کو آپ سے شرف صحبت حاصل نہیں ہے۔

ابوموسیٰ سیلانی وہ تابعی تھے جو علاقۂ سندھ کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے اس خطے میں علم حدیث کی نشر و اشاعت کے لئے کوششیں کیں۔

۱۵- یزید بن ابو کبشہ بن یسار:- یہ وہ تابعی تھے جن کو حجاج بن یوسف کی وفات کے بعد ولید بن عبدالملک نے بصرے کے منصبِ ولایت پر مامور کیا تھا۔ انہوں نے حضرت شرجیل بن اوس، حضرت ابوالدرداؓ اور بعض دیگر صحابہ کرامؓ سے روایتِ حدیث کی سعادت حاصل کی۔ بعد میں خود درسِ حدیث کا آغاز فرمایا۔ ان سے ابو بشر، حکم بن عتبہ، معاویہ بن قرہ اور ابراہیم بن عبدالرحمٰن نے احادیث روایت کیں۔

ابن حبان نے ان کا ذکر ثقہ راویوں میں کیا ہے۔

یزید بن ابو کبشہ سفر میں روزہ رکھنے کے قائل تھے اور روزہ رکھتے تھے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے۔

فکان یزید بن ابی کبشہ یصوم فی السفر

یعنی یزید بن ابو کبشہ حالتِ سفر میں روزہ رکھتے تھے۔

حجاج کے زمانے میں امیرِ جنگ کے عہدے پر متعین رہے۔

ان سے جو روایات مروی ہیں، ان میں سے ایک روایت مستدرک حاکم میں بطریقِ ابی بشر مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

سمعت یزید بن ابی کبشۃ یخطب بالشام یقول سمعت رجلا من اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یحدث عبدالملک بن مروان، ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، قال من شرب الخمر فاجلدوہ۔

یعنی ابو بشر کہتے ہیں، میں نے شام میں یزید بن ابو کبشہ سے خطبے کے دوران سنا وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک صحابی سے سنا ہے، وہ عبدالملک بن مروان کو بتا رہے تھے کہ کوئی شخص شراب نوشی کرے تو اس کو کوڑے لگاؤ۔

ایک روایت امام محمد بن حسن نے کتاب الآثار میں بھی نقل کی ہے جو یزید بن ابو کبشہ، حضرت ابوالدرداسے روایت کرتے ہیں۔

یزید بن ابی کبشہ ۹۶ھ میں سندھ آئے، لیکن یہاں آنے کے صرف اٹھارہ

ایک روایت یہ بھی ہے کہ سعد بن ہشام نے سرزمین ہند میں حضرت عمرؓ بن خطاب کے عہد خلافت میں مرتبۂ شہادت پایا۔

۱۳ — سعید بن اسلم کلابی :- یہ بنی ربیعہ بن کلاب سے تعلق رکھتے تھے اور تابعی تھے۔ امام بخاری نے تاریخ الکبیر میں لکھا ہے کہ سعید بن اسلم نے اپنے موالی سے جو بنی غفار سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، روایت حدیث کی۔ خود سعید بن اسلم نے بھی درس حدیث کی مسند بچھائی اور ان سے بکیر بن اشجع وغیرہ نے سماع روایت کی۔ ابن حبان نے ان کو تابعین میں شمار کیا ہے۔

ابن ماکولا کا کہنا ہے کہ سعید بن اسلم سندھ کے والی تھے اور ان کے والد اسلم بن زرعہ کے سپرد خراسان کی ولایت تھی۔

یہ بھی منقول ہے کہ سعید بن اسلم مکران کے والی بھی رہے اور وہیں شہید ہوئے۔ جب تک یہ سندھ میں رہے ترویج علم حدیث کو اپنا مطمح نظر ٹھہرائے رکھا۔

۱۴ — موسیٰ سیلانی :- یہ تابعی تھے اور سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ مقدمہ ابن الصلاح کے بیان معرفۃ الصحابہ میں حضرت انس سے موسیٰ سیلانی کی ایک ملاقات کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

لقیت انس بن مالک فقلت ھل بقی من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد غیرک ؟ فقال بقی ناس من الاعراب فقد رأوہ ، اما من صحبہ فلا۔

یعنی ابو موسیٰ سیلانی کہتے ہیں، میں حضرت انس بن مالک سے ملا، اور ان سے پوچھا، کیا آپ کے سوا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی اور صحابی باقی ہے ؟ فرمایا چند ایسے اعراب باقی ہیں، جنہوں نے آنحضرتؐ کو دیکھا تو ہے مگر ان کو آپ سے شرف صحبت حاصل نہیں ہے۔

ابو موسیٰ سیلانی وہ تابعی تھے جو علاقۂ سندھ کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے اس خطے میں علم حدیث کی نشر و اشاعت کے لئے کوششیں کیں۔

۱۵- یزید بن ابو کبشہ بن یسار:- یہ وہ تابعی تھے جن کو حجاج بن یوسف کی وفات کے بعد ولید بن عبدالملک نے بصرے کے منصبِ ولایت پر مامور کیا تھا۔ انہوں نے حضرت شرجیل بن اوس، حضرت ابوالدرداؓ اور بعض دیگر صحابہ کرامؓ سے روایتِ حدیث کی سعادت حاصل کی۔ بعد میں خود درسِ حدیث کا آغاز فرمایا۔ ان سے ابو بشر، حکم بن عتبہ، معاویہ بن قرہ اور ابراہیم بن عبدالرحمٰن نے احادیث روایت کیں۔

ابن حبان نے ان کا ذکر ثقہ راویوں میں کیا ہے۔

یزید بن ابو کبشہ سفر میں روزہ رکھنے کے قائل تھے اور روزہ رکھتے تھے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے۔

فکان یزید بن ابی کبشہ یصوم فی السفر

یعنی یزید بن ابو کبشہ حالتِ سفر میں روزہ رکھتے تھے۔

حجّاج کے زمانے میں امیرِ جنگ کے عہدے پر متعیّن رہے۔

ان سے جو روایات مروی ہیں، ان میں سے ایک روایت مستدرک حاکم میں بطریقِ ابی بشر مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

سمعت یزید بن ابی کبشۃ یخطب بالشام یقول سمعت رجلا من اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یحدث عبدالملک بن مروان، ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، قال من شرب الخمر فاجلدوہ۔

یعنی ابو بشر کہتے ہیں، میں نے شام میں یزید بن ابو کبشہ سے خطبے کے دوران سُنا وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک صحابی سے سنا ہے، وہ عبدالملک بن مروان کو بتا رہے تھے کہ کوئی شخص شراب نوشی کرے تو اس کو کوڑے لگاؤ۔

ایک روایت امام محمد بن حسن نے کتاب الآثار میں بھی نقل کی ہے جو یزید بن ابو کبشہ، حضرت ابوالدرداسے روایت کرتے ہیں۔

یزید بن ابی کبشہ ۹۶ھ میں سندھ آئے، لیکن یہاں آنے کے صرف اٹھارہ

دن بعد انتقال کر گئے ۔

یہ ان سینتیس عالی مقام تابعین میں سے پندرہ حضرات کا مختصر سا تذکرہ ہے جو اس برصغیر کے بعض اطراف واکناف میں تشریف لائے ۔

تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ برصغیر کے چند علاقے پہلی صدی ہجری ہی میں علم حدیث سے آشنا ہو گئے تھے ۔ پہلی جماعت جس نے اپنے قول وعمل سے یہاں کے باشندوں کو علم حدیث سے روشناس کرایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ان پچیس صحابہ کرام کی مقدس جماعت تھی جو مختلف اوقات ومواقع میں ۱۵ سے ۶۴ ھ (یعنی عہد عمر فاروق سے لے کر دور یزید) تک یہاں آئے ۔

اس کے علاوہ صحابہ کے تلامذۂ عظام، یعنی تابعین کی وہ جماعت یہاں علم حدیث پہنچانے کا ذریعہ بنی، جس کے متعدد ارکان کی قدم بوسی کا اس سرزمین کو شرف حاصل ہوا ۔

ان حضرات کا شمار آنحضرتؐ کے ارشاد کی رُو سے خیر القرون میں ہوتا ہے ۔ حدیث کی محبت ان کے رگ وریشے میں رچی ہوئی تھی تعلیمات نبوی کا یہ عملی نمونہ تھے ۔ انہوں نے اپنی زندگیاں اشاعت اسلام کے لئے وقف کر رکھی تھیں ۔ ان میں سے اکثر جہاد کی غرض سے یہاں آئے ۔ اسلام میں جہاد کو بنیادی عبادت کی حیثیت حاصل ہے اور آنحضرتؐ کی دعوت کو عوام تک پہنچانے کا یہ مؤثر ترین ذریعہ ہے ۔ زمانۂ جنگ میں ان کے کردار سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے ۔

یہ تو پتا نہیں چل سکا کہ اُس دور میں برصغیر میں حدیث کا کوئی مجموعہ تحریر وکتابت کی صورت میں مرتب ہوا ہو ۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض مقامات پر تابعین کے زمانے میں مسجدیں تعمیر ہوئیں، درس حدیث کے سلسلے شروع ہوئے ۔ طالبان حدیث کے بہت سے حلقے قائم ہوئے، اور اس طرح بہت جلد یہ علم برصغیر کے متعدد گوشوں میں پھیل گیا ۔

# دوسرے سالانہ
# محاضراتِ قرآنی
## (منعقدہ ۱۹ تا ۲۳، مارچ ۱۹۸۲ء)
# کی اجمالی رپورٹ

از قلم : ڈاکٹر عبدالسمیع
فیلو (رفیق) قرآن اکیڈمی

نوٹ : ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے اس رپورٹ میں ان مقالات اور تقاریر کی رپورٹنگ قدرے تفصیلی انداز میں کی ہے جو حکمت قرآن میں شائع نہیں ہوئے۔ لہٰذا قارئین کو اگر کہیں کوئی علمی یا ادبی سہو اس میں نظر آئے تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اسے رپورٹنگ کی سہو متصور کیا جائے۔ (ادارہ)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام دوسرے سالانہ محاضرات قرآنی کا انعقاد جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں ۱۹ تا ۲۳، مارچ ۱۹۸۲ء کو عمل میں آیا پہلے اور آخری روز اس کے اجلاس نماز عصر سے نماز عشاء تک ہوئے جبکہ درمیانی ایام میں روزانہ مغرب اور عشاء کے مابین طویل نشستیں ہوئیں۔

جمعۃ المبارک ۱۹، مارچ ۸۲ء کی صبح ہی سے جامع القرآن میں آیات قرآنی اور دعوت قرآنی کے خوبصورت پوسٹر دیواروں پر آویزاں کر دیئے گئے۔ مسجد کے جنوبی طرف پختہ سٹیج سے نیچے تقریباً ایک فٹ اونچا ایک سٹیج تیار کیا گیا جس پر مسجد کی مناسبت سے، فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا۔

محاضرات قرآنی کا افتتاحی اجلاس بعد نماز عصر منعقد ہوا۔ جس میں میئر حیدرآباد اور مہتمم و صدر مدرس جامعہ اسلامیہ حیدرآباد، مولانا سید وصی مظہر ندوی مدظلہ العالی نے "شریعتِ اسلامی کے ماخذ اور قرآنِ حکیم سے تخریجِ احکام کے اصول"

پر مفصل خطاب فرمایا۔ حاضری کافی حوصلہ افزا تھی حاضرین نے بڑی توجہ سے فاضل مقرر کے خیالات کو سُنا مولانا نے اپنی تقریر کا آغاز دین اسلام کے جامع اور مکمل ہونے کے تذکرے سے فرمایا اور توجہ دلائی کہ یہ زمانے کی حدود و قیود سے آزاد ہے لہٰذا شریعت کے مآخذ بھی ایسے ہونے چاہییں جو تمام ضروریات کو پورا کریں ... آپ نے شریعت کے چار مآخذ قرار دیئے۔

(۱) قرآن حکیم (۲) سنت یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کا ثابت شدہ طریقہ۔ سُنّت کے ضمن میں انہوں نے وضاحت فرمائی کہ اس کا علم احاد کے ذخیرے سے حاصل ہوتا ہے۔ (۳) قیاس یعنی جن معاملات یا مسائل میں قرآن و سُنّت میں کوئی منصوص حکم موجود نہ ہو وہاں قرآن و سنّت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اور کسی اور حکم سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے مسئلے کو حل کیا جائے۔ قیاس کے ضمن میں مولانا نے فرمایا کہ جو شخص قیاس کے ذریعے کوئی حکم اخذ کرتا ہے اس پر وہ حکم واجب ہے نیز یہ کہ قیاس کرنے والا یعنی مجتہد "مصیب" بھی ہو سکتا ہے اور "مخطی" بھی بہ صورت دو اجر کا حقدار ہوتا ہے اگرچہ نصف ہی کیوں نہ ہو۔ قیاس کے دلائل کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے قرآن مجید کی دعوتِ فکر و اعتبار کا حوالہ دیا اور سُنت سے قیاس کے جواز میں مولانا نے حضرت معاذؓ ابن جبل کے حاکم بنا کر بھیجے جانے کے وقت حضورؐ کے سوالات اور حضرت معاذؓ کے جوابات پر حضورؐ کی تصویب کا حوالہ دیا۔ (۴) اجماع: یعنی کسی دور میں قیاس پر اُمّت کا جمع ہو جانا۔ اس ضمن میں مولانا نے وضاحت فرمائی کہ اجماع قرآن کے کسی حکم کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے، سُنّت کے کسی حکم کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے ....

اس کے بعد فاضل مقرر موضوع کے دوسرے جزو کی طرف آئے یعنی "قرآن حکیم سے تخریج احکام کے اصول" اس سلسلے میں آپ نے مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھنے پر زور دیا۔

۱۔ قرآن مجید کی حیثیت:۔ یہ کہ جس کتاب سے ہم قانون اخذ کرنے چلے ہیں وہ کوئی کتابِ قانون نہیں بلکہ وحی الٰہی ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لئے اتاری گئی ہے۔

۲ - کتاب کی نوعیت :- یہ کہ قرآن مجید عام نوعیت کی کتاب نہیں ہے جس میں متعین ابواب ہوتے ہیں بلکہ کتاب ہدایت ہے جس میں قوانین کے ذکر کے ساتھ اخلاق، عقائد اور عبادات کا بھی تذکرہ ہے۔

"لہٰذا صرف ایک آیت نہیں پورا قرآن مجید سامنے ہونا چاہیئے" نیز پورے حالات سامنے ہونے چاہئیں اور قانون سازی کا "صحیح مقصد" بھی پیش نظر ہونا ضروری ہے۔ "صحیح مقصد" کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے درج ذیل اُمور کو قانون سازی کے بنیادی مقاصد قرار دیا:

ا - انسان اللہ کی بندگی بجا لائیں۔

ب - دُنیا امتحان گاہ ہے اور اس میں انسان کے حسن کردار کا امتحان ہے۔ لہٰذا قانون بھی ایسا چاہیئے جو تمہیں اس امتحان میں کامیاب کرے۔

ج - اس سے معروف کا قیام اور منکر کا استیصال ہو تاکہ "حکم الٰہی "الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر" کی منشا پوری ہو جائے۔

د - قوانین انسان کی فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔

ہ - عدل و انصاف قائم کرنا پیش نظر ہو۔

س - قوانین میں توسط اور اعتدال ہونا چاہیئے۔

ص - دفع حرج - بندوں پر تنگی اور تشدد نہ ہو۔

(ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم)

ط - قلت تکالیف :- حتی الوسع کوشش کی جائے کہ ضوابط کے ذریعے لوگوں کو باندھ کر نہ رکھا جائے۔

ع - قرآن کے نظم اور ترتیب کو ملحوظ رکھنا - کہیں سے کوئی ایک آیت لے کر قانون بنانا درست نہیں۔

ف - فہم قرآن اور تدبر قرآن کے لئے اُمت کی سابقہ کوششوں کو نظر انداز کرنا درست نہ ہوگا۔

آپ نے آخر میں وضاحت فرمائی کہ "سنت متواتر" کے ذریعے قرآن حکیم کے عام

حکم میں تخصیص ہو سکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر "خبر واحد" سے قرآن کے کسی حکم کی تردید نہیں ہو سکتی ۔

پہلا باقاعدہ اجلاس :۔ اس افتتاحی تقریب کے بعد محاضرات قرآنی کا پہلا باقاعدہ اجلاس بعد نماز مغرب منعقد ہوا ۔ پروگرام کے مطابق اس اجلاس کی صدارت جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث حضرۃ مولانا محمد مالک کاندھلوی نے فرمائی ۔ اس اجلاس کا موضوع تھا " مسئلہ مزارعت اور احادیث نبویہ " (علی صاحبہا الصلوٰۃ و السلام) اس موضوع پر ایک ضخیم اور فکر انگیز مقالہ مولانا محمد طاسین صاحب، صدر مجلس علمی کراچی، تحریر فرما کر لائے تھے ۔ اسی کا ایک خلاصہ مولانا موصوف نے پیش فرمایا ۔ اس اجلاس میں مولانا محمد اسحاق بھٹی اور حافظ عبدالرحمن صاحب المدنی کو بھی مذاکرے میں حصہ لینا تھا مگر وہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر تشریف نہ لا سکے البتہ حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب کا مختصر مگر جامع مقالہ جس موصول ہو گیا جس کو پڑھ کر سنا دیا گیا ۔ حضرت مولانا نے مختصر الفاظ میں مزارعت پر کلام کیا اور امام ابوحنیفہؒ کی رائے یعنی مزارعت کے عدم جواز کو اصل حکم اور اس کے جواز میں قاضی ابو یوسفؒ کی رائے کو رخصت سے تعبیر فرمایا ۔

جناب مولانا محمد طاسین صاحب نے اپنے حد درجہ محققانہ مقالے کا آغاز موضوع کی اہمیت کو ان الفاظ سے واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ مزارعت کے ضمن میں مسئلہ کی نوعیت شریعت و فقہ اسلامی میں "اولیٰ" اور "مصیب" کی نہیں "صحیح" یا "بطلان" کی ہے ۔ صحت کی صورت میں دو طبقات وجود میں آتے ہیں یعنی "ادنیٰ" اور "اعلیٰ" جبکہ بطلان کی صورت میں کاشتکار ہی مالک ہیں ۔ اس اعتبار سے انہوں نے یہ بات بڑی شدت تاثر کے ساتھ کہی کہ مزارعت کے مسئلے میں کوئی حتمی رائے قائم کئے بغیر اسلامی نظام معیشت کا تعین ناممکن ہے ۔ مولانا نے مسئلہ مزارعت کو پانچ سطحوں پر پرکھا ۔ جو مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) مزارعت اور قرآن حکیم ۲ ۔ مزارعت اور مرفوع احادیث
۳ ۔ مزارعت اور احادیث
۴ ۔ مزارعت اور آثار صحابہ (۵) مزارعت اور آثار تابعین

مزارعت کا قرآن حکیم کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے بتایا کہ مزارعت کے بارے میں صراحت کے ساتھ کوئی حکم موجود نہیں — عام معاشی معاملات میں اصول اور کلی احکام کا تذکرہ فرماتے ہوئے مولانا نے وضاحت فرمائی کہ قرآن مجید میں اصول انسانی کتابوں کی مانند بیان نہیں ہوئے قرآن مجید بہت سے مسائل کے بارے میں اصول کسی جزوی اور عام مسئلے کے ذکر ہی کے ضمن میں بیان فرماتا ہے۔ قرآن مجید میں اصول معاشیات کے بیان میں مولانا نے آیت اَحَلَّ اللّٰہُ البیع وحرم الربٰو[1] کا حوالہ دیا اور فرمایا اس آیت کی رو سے وہ تمام معاشی معاملات جو "بیع" کی نوعیت کے ہوں جائز ہیں اور وہ تمام معاملات جو "ربا" کی نوعیت کے ہوں حرام ہیں ۔ ۔ ۔ اس اصول کو مزارعت پر لاگو کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مزارعت "ربا" سے مشابہ ہے چونکہ اولاً یہ کہ زمین محفوظ رہتی ہے بالکل اسی طرح جیسے اصل زر محفوظ ہوتا ہے ثانیاً یہ کہ اس کے نتیجے میں محنت و مشقت نہیں ہوتی ثالثاً یہ کہ اس سے وہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جو "ربا" کے نتیجے میں جنم لیتی ہیں۔ معاشی معاملات میں جس دوسری آیت قرآنی کو فاضل مقالہ نگار نے اصول قرار دیا وہ یہ ہے "یاایھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃً عن تراضٍ منکم[2] اس آیت سے یہ اصول سامنے آتا ہے کہ وہ تمام طرق تجارت و معیشت جن میں ایک فریق کی حقیقی رضا مندی نہ ہو، فاسد ہیں ۔ ۔ ۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے جب مزارعت پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کاشتکار کی حقیقی مرضی شامل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی مجبوری ہوتی ہے جو اسے معاملے پر رضامند کرتی ہے کیونکہ جس شخص کے پاس بقدرِ ضرورت ذاتی زمین ہو وہ کبھی بٹائی پر زمین کاشت نہیں کرتا —

احادیث کی طرف آتے ہوئے موصوف مولانا نے بتایا کہ تیرہ صحابہ کرامؓ سے

---

[1] اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور ربٰو (سود) کو حرام (البقرۃ : ۲۷۵)

[2] اے ایمان والو ! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل ذریعے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ کوئی مال باہمی رضامندانہ تجارت کی راہ سے حاصل ہو جائے (النساء ۲۹)

مزارعت کے بارے میں احادیث مروی ہیں - ان میں سے حضرت جابر سے گیارہ اور حضرت رافع ابن خدیج سے تیرہ روایات منقول ہیں - مولانا نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ان احادیث کے بارے میں تو نسخ و منسوخ کا کام ہوا ہے اور نہ جمع و تطبیق اور ترجیح ہی کا -

اپنے صدارتی خطبے میں مولانا محمد مالک کاندھلوی نے فقہی دلائل سے مزارعت کی حلت کو واضح کرنے کی کوشش کی اور فرمایا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ صاحبین (یعنی قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) حضرت شیخ یعنی امام ابو حنیفہؒ سے کوئی مختلف رائے رکھتے ہوں لہٰذا امام صاحب کی رائے بھی یقیناً مزارعت کے حق ہی میں ہوگی -

**دوسرا اجلاس :** محاضرات قرآنی کا دوسرا باقاعدہ اجلاس ۲۰ مارچ بروز ہفتہ بعد نماز مغرب جامع القرآن ہی میں منعقد ہوا - اس اجلاس کی صدارت جامعہ نعیمیہ لاہور کے مہتمم اور صدر مدرس، جناب مفتی محمد حسین نعیمی صاحب نے فرمائی - اس نشست میں بھی مولانا طاسین صاحب نے اسلامی معاشیات ہی کے ایک دوسرے اہم مسئلے یعنی "مضاربت" کو قرآن و حدیث کی روشنی میں" پرکھا نیز اس نشست میں بھی حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب کا مختصر مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے خود پڑھ کر سنایا۔ فاضل مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں حضرت ابن عباسؓ کی عاید کردہ شرائط کا بھی تذکرہ فرمایا جو یہ ہیں -

ا - اس مال کو لے کر بحری سفر نہ کیا جائے -
ب - نشیبی علاقے میں مال لے کر نہ جایا جائے -
ج - مال کو جانور خریدنے کے کام میں نہ لائے جائے -

مولانا نے اپنے مقالے میں حضرت عبداللہ اور عبیداللہؓ کا مال زکوٰۃ لیکر مدینہ آتے ہوئے اس کو کاروبار میں لگانے کو بھی مضاربت سے تعبیر فرمایا - اور بالآخر مضاربت کی جو شرائط بیان فرمائیں ان میں سے کچھ حسب ذیل ہیں -

ا - کاروبار میں جتنا روپیہ لگانا ہو وہ طے ہو اور بتایا جائے کہ وہ کہاں لگایا جائے گا -

۲ - روپیہ عملاً دے دیا جائے۔
۳ - تناسبِ نفع طے ہو۔
۴ - اگر طے نہ ہو تو نفع آدھا آدھا تقسیم ہو۔
۵ - نفع کی صورت میں دونوں شریک ہوں۔
۶ - اگر نقصان بذمہ کارکن ہوگا تو معاملہ فاسد ہوگا۔
۷ - اسی طرح اگر نقصان میں دونوں شریک ہوں گے تب بھی بیع فاسد ہوگی۔

اس کے بعد مولانا طاسین صاحب نے اپنا حد درجہ تحقیقی مقالہ بعنوان "المضاربۃ — حقیقت اور شرعی حیثیت" پڑھ کر سنایا — مضاربۃ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ مضاربت وہ معاشی معاملہ ہے جس میں ایک شخص کا مال اور دوسرے کا وقت اور محنت صرف ہوتی ہے اور طے یہ پاتا ہے کہ اگر نفع ہوگا تو دونوں تقسیم کریں گے اور اگر نقصان ہوگا تو صرف سرمایہ لگانے والا اس کو برداشت کرے گا۔

مولانا نے "مضاربت" اور "ربوٰ" میں فرق کو واضح فرماتے ہوئے بیان کیا کہ مضاربت والا مال امانت ہوتا ہے جبکہ ربوٰ میں مال قرض کے طور پر ملکیت بنتا ہے۔ اسی طرح اوّل الذکر میں نفع کی تقسیم نفع کی مناسبت سے ہوتی ہے جبکہ موخر الذکر میں سالانہ سرمایے کی مناسبت سے — اسی طرح شراکت اور مضاربت میں فرق کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ شراکت وہ کاروباری معاملہ ہے جو دو افراد کے مابین سرمایہ اور محنت دونوں کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے جبکہ مضاربت میں ایک کی محنت یا محنت اور سرمایہ جبکہ دوسرے کا صرف سرمایہ شریکِ کاروبار ہوتا ہے۔ لہٰذا اصل زر کے نقصان کے احتمال کے پیشِ نظر تقسیم نفع ناممکن ہے۔ لہٰذا مضاربت کا سرمایہ صنعت و تجارت میں نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے برعکس اگر سرمایے والے فریق کو یقین دلا دیا جائے کہ اس کا سرمایہ قرض کی طرح محفوظ رہے گا اور اسی طرح کم سے کم ماہانہ یا سالانہ فی صد شرحِ منافع بھی معین کر دی جائے تو یہ معاملہ "ربوٰ" سے مشابہ ہو جائیگا۔

مضاربت کی لغوی بحث کے ضمن میں مولانا نے فرمایا کہ "ضرب" کا فعل قرآن مجید میں مندرجہ ذیل معانی میں استعمال ہوا ہے -

(i)- مارنا ۱۲ مرتبہ (ii) مثال بیان کرنا ۳۰ مرتبہ
(iii)- زمین میں چلنا ۶ مرتبہ (iv) کسی پر ڈال دینا ۴ مرتبہ
(v)- سلانا - کان پر تھپکی دینا -

مضاربت کی شرعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار نے یہ سوال پیش فرمایا کہ معلوم کیا جائے - کہ مضاربت واجب ہے. مستحب ہے یا کہ مباح ہے؟

نوعیت جواز پر باقاعدہ کلام کرتے ہوئے مولانا نے سب سے پہلے قرآن مجید کی تین آیات کا تذکرہ کیا - پہلی سورۃ المزمل کی آخری آیت — اور وضاحت کی کہ وہاں لفظ صرف مضاربت کے معنوں میں نہیں ہے کیونکہ عربوں کے ہاں یہ معاملہ "قراض" یا "مقارضہ" کے نام سے موسوم ہے - دوسری آیت سورہ جمعہ کی "وابتغوا من فضل اللّٰہ" اور تیسرے نمبر پر تجارت کے تذکرے میں [illegible] کے ذکر میں سورۃ بقرہ کی ایک آیت — لہٰذا آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں مضاربت کے جواز یا عدم جواز کے سلسلے میں کوئی جزوی یا کلی حکم نہیں ہے — [illegible] مضاربت کا جواز صرف "اجماع" سے ثابت ہے — [illegible] مولانا نے وضاحت فرمائی کہ وہ خود اس کے جواز کے قائل ہیں -

احادیث کی طرف آتے ہوئے مولانا نے واضح فرمایا کہ صحاح ستہ میں سے بخاری، مسلم، ترمذی، [illegible] اور نسائی میں [illegible] کوئی باب نہیں [illegible] اس موضوع پر [illegible] کوئی [illegible] نہیں ہے — [illegible] میں صرف دو حدیثیں آئی ہیں مگر اصلاً ان میں [illegible] البتہ ابن ماجہ میں باب الشرکۃ والمضاربۃ [illegible] -

اس [illegible] ہیں [illegible] دی گئی تھی ان میں سے [illegible] ڈاکٹر [illegible] صدر شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب، تو تشریف نہ لا سکے البتہ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد سعید صاحب

صدر شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن جامعہ پنجاب، اور پروفیسر منظور حسین مرزا، وائس پرنسپل گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور نے مذاکرے میں حصہ لیا اس کے علاوہ حاضرین میں سے ایک صاحب، جو ایک بنک کے تربیتی ادارے میں استاذ کے فرائض انجام دے رہے ہیں، نے پی ایل ایس اکاؤنٹس کے بارے میں کچھ وضاحتیں فرمائیں۔ آخر میں صاحبِ صدر مولانا مفتی محمد حسین نعیمی نے اپنا صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا۔ مفتی صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ لمیٹڈ کمپنی ایکٹ انہیں بہم پہنچایا جائے تاکہ وہ اس کا مطالعہ کرسکیں۔ اس کے بعد ہی وہ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکتے ہیں۔

**تیسرا اجلاس** : ۲۱ مارچ بروز اتوار "حکمت و تشریعِ قرآنی" کے موضوع پر محاضرات کا تیسرا اجلاس بعد نمازِ مغرب منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب کے استاد جناب ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب نے فرمائی — اس اجلاس میں سب سے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے موصول ہونے والا ایک انتہائی علمی مقالہ بعنوان "قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت" پڑھ کر سنایا گیا — اس کے علاوہ "قرآن کا نظریہ معرفت" کے عنوان سے اپنا مقالہ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب، استاذ شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب اور اعزازی انچارج قرآن اکیڈمی نے بزبان انگریزی پڑھ کر سنایا۔ نیز "قرآن مجید اور ضمیر بیدار" کے عنوان سے ایک ضمیر کو بیدار کرنے والا مقالہ استاذ محترم جناب حافظ احمد یار صاحب نے پڑھا اس کے بعد چودھری محمد رفیق صاحب نے اپنا مختصر مگر جامع مقالہ بعنوان "[illegible]" پڑھ کر سنایا۔ آخر میں صاحب صدر نے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا۔

**چوتھا اجلاس** : محاضرات کا چوتھا اجلاس ڈاکٹر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ڈاکٹر [illegible]
[illegible] پڑھا جس پر [illegible]

خیالات کا اظہار فرمایا[1]۔ جن حضرات نے اس مذاکرے میں حصہ لیا ان کے اسمار گرامی یہ ہیں ۔ جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، جناب علامہ سید غلام شبیر بخاری، جناب ڈاکٹر عبدالرؤف اور حافظ نذیر احمد صاحب، جناب مرزا محمد منور صاحب بوجہ علالت اس اجلاس میں شریک نہ ہو پائے ۔

**پانچواں اجلاس :** محاضراتِ قرآنی کا پانچواں اور آخری اجلاس مقررین حضرات کی حاضری کے اعتبار سے حادثات کی نظر ہوگیا ۔ اجلاس کو ۲۲ ر مارچ بعد نماز عصر شروع ہونا تھا مگر پروفیسر عضدالدین صاحب جو جامع علی گڑھ سے تشریف لائے ہوئے تھے اور دیگر دو مقررین یعنی مولانا محمد حنیف ندوی اور ڈاکٹر خالد علوی کی معذرت کے باعث بعد نماز مغرب شروع ہوا ۔ عصر اور مغرب کے مابین محفل استماعِ قرآن منعقد ہوئی اور شیخ محمود خلیل الحصری مرحوم کی آواز میں سورۃ شوریٰ کی تلاوت کا ریکارڈ سنا گیا ۔ بعد نماز مغرب جناب پروفیسر مرزا محمد منور صاحب اور صدر مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قرآن اور احیائے اسلام موضوع پر خطاب فرمایا ۔ اُس میں صدر مؤسس نے 'انقلاب' کے چھ عمومی مراحل کا تذکرہ کیا اور پھر انقلابِ محمدیؐ میں اُن مراحل کو وضاحت سے بیان کیا ۔ انہوں نے قرآن مجید کے حوالے سے آنحضورؐ کی مکی و مدنی زندگی سے استشہاد کیا اور فرمایا کہ حضورؐ کی مکی زندگی انقلاب کے ابتدائی مراحل یعنی تربیت، تزکیہ اور تنظیم کی آئینہ دار ہے اور مدنی دور بقیہ تین مراحل کی عکاسی کرتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے واشگاف الفاظ میں واضح کیا کہ آئندہ بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا احیائے اسلام کا خواب ان مراحل سے گزرے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب کے دعائیہ کلمات پر دوسرے سالانہ محاضراتِ قرآنی اختتام پذیر ہوئے ۔

'HIKMAT-E-QURAN'

Vol. 1 | SEPTEMBER-OCTOBER 1982 | No. 7-8

# حکمتِ قرآن

کا گذشتہ شمارہ جو

# دعوت
# رجوع اِلَی القرآن
کا منظر و پس منظر

کے موضوع پر

## ڈاکٹر اسرار احمد

کے چار مضامین پر مشتمل ہے اور اپنے موضوع پر

ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے

دفتر میں محدود تعداد میں موجود ہے

قیمت فی پرچہ — ۵ (محصول ڈاک علاوہ)